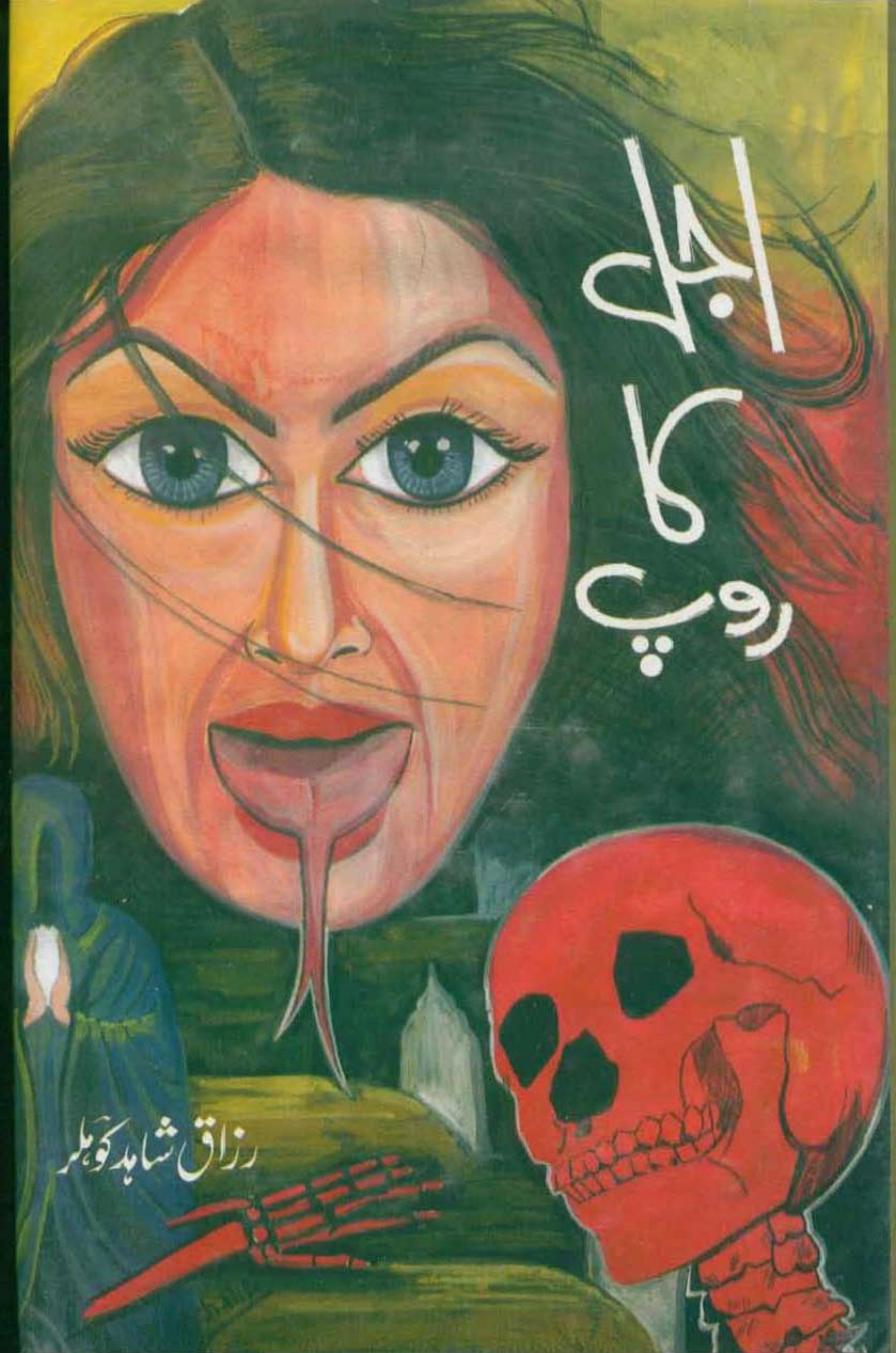

اجل کا روپ
رزاق شاہد کوہلر

اجل کا روپ

مصنف

رزاق شاہد کوہلر

علم و عرفان پبلشرز

34۔ اردو بازار، لاہور فون: 7232336-7352332

نام کتاب	......	اجل کا روپ
مصنف	......	رزاق شاہد کوہلر
ناشر	......	گلفراز احمد علم وعرفان پبلشرز، لاہور
مطبع	......	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
سرورق	......	حنا خالد
کمپوزنگ	......	رانا ابرار احمد
پروف ریڈنگ	......	زاہد ملک
سنِ اشاعت	......	نومبر 2006ء
قیمت	......	120/روپے

علم وعرفان پبلشرز

34۔اردو بازار، لاہور فون: 7232336-7352332

سیونتھ سکائی پبلی کیشنز

غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40۔اردو بازار، لاہور

فون: 7223584، موبائل 0300-4125230

انتساب!

اچھا ادب پڑھنے

والوں

کے

نام

آئینہ



مصر کی ساحرہ

پیرا فائن شپنگ کمپنی کا مشہور بحری جہاز گیلنٹ تھرٹی سیون بحر ہند کی سرکش موجوں کو چیرتا ہوا تیزی سے براعظم افریقہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ فضا پرسکون تھی اور صاف و شفاف آسمان پر ننھے منے ستارے برقی قمقموں کی طرح ٹمٹمار ہے تھے۔ رات تقریباً آدھی سے زیادہ کٹ چکی تھی تاہم قمری مہینے کی آخری تاریخیں ہونے کی وجہ سے چاند ابھی تک طلوع نہیں ہوا تھا۔ رات کے سناٹے میں صرف جہاز کے انجن کی آواز گونج رہی تھی۔

گیلنٹ تھرٹی سیون افریقہ کا ایک مشہوری بحری جہاز تھا۔ اس مشہور و معروف مسافر بردار جہاز کی آخری منزل جنوبی افریقہ کی بڑی بندرگاہ کیپ ٹاؤن تھی لیکن راستے میں اسکندریہ اور پورٹ سعید جیسی اہم بندرگاہ پر بھی اسے لنگر انداز ہونا تھا۔ کیونکہ جہاز میں سوار آدھے سے زیادہ مسافروں کا تعلق مصر سے تھا۔ جہاز کے قریب قریب تمام کیبن اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے صرف اکا دکا کیبن روشن نظر آرہے تھے جن میں مقیم مسافر بھی شاید جاگ رہے تھے کیونکہ ان کی منزل قریب تھی۔ جہاز نے صبح سویرے اسکندریہ کی بندرگاہ پر لنگر ڈالنا تھا۔

اس وقت ایک درمیانے درجے کے کیبن میں دونو جوان پوری طرح جاگ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں دور دور تک نیند کا نام ونشان نہیں تھا۔ وہ دونوں ایشیائی تھے ان میں سے ایک کا تعلق اسلامیہ جمہوریہ پاکستان سے تھا۔ جب کہ دوسرا ہندوستانی تھا۔ دونوں کی وضع قطع ایک تھی۔ دونوں ہم زبان تھے اگر ان دونوں کے درمیان کوئی فرق تھا تو وہ صرف مذہب کا تھا۔ ایک خدائے واحد کا پیروکار تھا تو دوسرا پتھر کی مورتیوں کا۔ مگر اس وقت وہ دونوں ایک دوسرے کے جگری یار نظر آرہے تھے۔

پاکستانی کا نام بابر زمان تھا وہ کراچی کے ایک مشہور صنعتکار اختر زمان کا اکلوتا بیٹا تھا

اور قاہرہ الازہر یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔ اختر زمان چاہتا تو اپنے اکلوتے بیٹے کو آکسفورڈ جیسی عظیم یونیورسٹی میں بھی پڑھا سکتا تھا لیکن بابر کا مذہب کی طرف رجحان دیکھ کر اختر زمان نے الازہر یونیورسٹی قاہرہ کو ترجیح دی تھی۔ قاہرہ کی یہ مشہور یونیورسٹی قدیم و جدید اسلامی علوم کا گہوارہ تھی اور دنیا بھر میں مشہور تھی۔

ہندوستانی کا تعلق ممبئی سے تھا اور اس کا نام روہیت کھنہ تھا۔ وہ ممبئی کی ایک فلم کمپنی میں ملازم تھا جو پورے ہندوستان میں دستاویزی فلمیں بنانے کے لیے مشہور تھی۔ بابر اور روہیت کھنہ تقریباً ہم عمر ہی تھے۔ ایک کیبن میں رہتے ہوئے وہ جلد ہی ایک دوسرے سے گھل مل گئے۔ مذہب کی دیوار ان کے آڑے نہ آسکی۔ روہیت کھنہ پہلی بار مصر کے لیے عازم سفر ہوا تھا جب کہ بابر گزشتہ دو ڈھائی سال سے مصر میں مقیم تھا اور یہ روہیت کھنہ کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بابر زمان جیسا ہم سفر مل گیا تھا۔ بابر کی وجہ اس کی کافی ساری پرابلمز حل ہوتی نظر آرہی تھیں۔ رہائش کا مسئلہ تو بابر نے اسے ہاسٹل میں ٹھہرانے کی پیش کش کر کے حل کر دیا تھا اور فلم کی عکس بندی کرانے میں بھی بابر نے اس کی مدد کرنے کی حامی بھر لی۔ دونوں ایڈونچر پسند تھے اس لیے بحری جہاز سے سفر کر رہے تھے۔

روہیت کھنہ کے بیگ میں ایک جگہ جدید طرز کا ویڈیو کیمرہ موجود تھا۔ البتہ بابر زمان کے بیگ میں صرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ ''یار بابر! مصر کے تاریخی مقامات کے متعلق تو تمہاری معلومات کافی حد تک وسیع ہوں گی؟'' روہیت نے کیبن میں چھائی خاموشی کو توڑتے ہوئے سوال کیا۔

''کیوں نہیں قاہرہ شہر کے چپے چپے سے میں واقف ہوں۔ وہاں کی قدیم مساجد، اہرام مصر، عجائب گھر، قدیم و معروف قہوے خانے سب میرے دیکھے بھالے ہیں۔'' بابر نے بلا تمہید جواب دیا۔

''پھر تو میں کسی مشکل کا سامنا کیے بغیر چند دنوں میں ویڈیو فلم تیار کرلوں گا۔'' روہیت نے اس کا جواب سن کر خوشی کا اظہار کیا۔

''خوش فہمی ہے تمہاری، شاید تمہیں معلوم نہیں کہ قاہرہ عرب دنیا کا سب سے بڑا، مشہور و معروف اور قدیم شہر ہے۔ وہاں غیر ملکی سیاحوں کی اتنی زیادہ آمد و رفت رہتی ہے کہ ہفتہ دس دن تو تمہیں لوکیشنز دیکھتے ہوئے لگ جائیں گے۔ یوں سمجھ لیں کہ قاہرہ شہر ہی اصل مصر

ہے۔''

''یہ اہرام مصر کیا چیز ہے؟'' روہیت نے موضوع بدل کر پوچھا۔

بابر نے اس کا سوال سن کر ایک لمحے کے لیے توقف کیا اور پھر عام فہم لہجے میں بولا۔ ''اہرام مصر کے متعلق میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ وہ قدیم مینار ہیں جن کے بارے میں عام روایت ہے کہ یہ طوفان نوح سے بھی پہلے موجود تھے اور یہ تو حتمی طور پر ثابت ہے کہ ان کی عمر یونان کی علمی ترقی سے زیادہ ہے کیونکہ جالینوس نے اپنی تصنیف میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ مینار بہت زیادہ تعداد میں تھے لیکن صلاح الدین ایوبی کے دور میں اکثر مینار گرا دیے گئے تھے۔ ان میں سے جو باقی رہ گئے ہیں اور جن پر واقعی اہرام کا اطلاق ہوتا ہے ان کی تعداد صرف تین ہے۔ جو مینار سب سے بڑا ہے اس کی لمبائی 480 فٹ ہے۔ نیچے کے چبوترے کا ہر ضلع 764 فٹ ہے۔ مینار کا مکعب 8 کروڑ نوے لاکھ فٹ ہے اور وزن اڑسٹھ لاکھ چالیس ہزار ٹن ہے۔ اس کی تعمیر میں ایک لاکھ آدمی تقریباً بیس سال تک کام کرتے رہے اور یہ پتھروں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ پتھروں کو اس طرح جوڑا گیا ہے کہ جوڑ یا درز کا معلوم ہونا تو ایک طرف رہا چونے اور مسالے کا اثر بھی معلوم نہیں ہوتا۔ مضبوطی اور استحکام کا یہ عالم ہے کہ ہزار ہا برس گزرنے کے باوجود جوڑوں میں بال برابر بھی فرق پیدا نہیں ہوا۔''

روہیت کسی بچے کی طرح بابر زمان سے سوال پہ سوال کیے جا رہا تھا اور بابر کو جتنا کچھ معلوم تھا اسے تفصیل کے ساتھ بتاتا رہا۔ رات کا بقیہ حصہ ان دونوں نے جاگ کر بسر کیا۔

صبح سورج طلوع ہونے سے چند لمحے پیشتر جہاز اسکندر کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہو چکا تھا۔ جہاز کے لنگر انداز ہونے کے بعد تقریباً ایک چوتھائی مسافر اسکندریہ کی بندرگاہ پر بمعہ اپنے ساز و سامان کے اتر گئے۔

بابر زمان اور روہیت کھنہ تھوڑی دیر بندرگاہ پر گھومتے رہے۔ دونوں نے اپنے اپنے بیگ کندھوں پر لٹکا رکھے تھے۔ مصر کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی روہیت ایک پراسرار قسم کے سحر میں گرفتار ہو گیا تھا۔

قاہرہ تک سفر ان دونوں نے بائی روڈ کیا تھا۔ بابر خاموشی کے ساتھ اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا تاہم روہیت اردگرد کے دلفریب مناظر میں کھویا ہوا تھا۔ اس کی پرتجسس نگاہوں میں ایک اشتیاق تھا۔ دیوتاؤں کی سرزمین کا ایک باسی پڑھا لکھا ہونے کے باوجود توہم پرست تھا۔

قاہرہ پہنچنے کے بعد انہوں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور الازہر یونیورسٹی کی طرف روانہ ہو گئے۔ اگرچہ رات کا وقت تھا لیکن قاہرہ شہر کی سڑکیں اور بازار آباد تھے۔ ہر طرف گہما گہمی اور انسانوں کا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ ٹیکسی مختلف سڑکوں اور چوراہوں سے گزرتی ہوئی آخر کار الازہر یونیورسٹی کے عالیشان گیٹ پر پہنچ کر رک گئی۔ بابر نے ٹیکسی سے اترنے کے بعد ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور بیگ کاندھے سے لٹکائے گیٹ کی طرف چل پڑا۔ روہیت کھنہ اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

اپنے روم میٹس سے بابر نے روہیت کھنہ کو بحیثیت ایک دوست کے متعارف کروایا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد روہیت کھنہ کی فرمائش پر بابر اسے ایک قدیم قہوہ خانے میں لے گیا جہاں وہ دونوں گرما گرم قہوے سے محظوظ ہوئے۔ قہوہ خانے میں انہیں ایک عجیب وغریب مصری مل گیا جس کا دعویٰ تھا کہ وہ ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر حرف بہ حرف مستقبل کا حال بتا سکتا ہے۔ بابر نے اسے آزمانے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ سامنے کر دیا۔ مصری چند لمحے تو بڑے غور وخوض کے ساتھ بابر کا ہاتھ دیکھتا رہا پھر چونک کر بولا۔

''دوست! آپ کو شاید میری بات پر یقین نہ آئے لیکن میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ عنقریب آپ کا واسطہ بڑے حیرت انگیز اور مافوق الفطرت واقعات سے پڑے گا اور آپ ایک بڑی مصیبت میں گھر جائیں گے۔''

بابر نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ مذاق اچھا کر لیتے ہیں لیکن آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں ایسی بے سروپا باتوں پر یقین نہیں رکھتا اور نہ ہی میں توہم پرست ہوں اور امید ہے آپ میری باتوں کا برا نہیں مانیں گے۔''

''میرا کام بتانا تھا......'' مصری ناگوار لہجے میں بولا۔ ''یقین کرنا نہ کرنا آپ کے اپنے اختیار میں ہے۔''

بابر بولا۔ ''ٹھیک ہے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو مجھے اجازت دیجئے البتہ میں آپ کی فیس دینے کے لیے تیار ہوں۔''

''میں فیس ان سے لیتا ہوں جو میری باتوں کا یقین کرتے ہیں۔'' اتنا کہہ کر مصری اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بابر آگے بڑھ گیا۔

قہوہ خانے سے نکلنے کے بعد بابر اور روہیت کھنہ ایک نائٹ کلب میں داخل

ہو گئے۔ اسٹیج پر ایک حسین وجمیل مصری رقاصہ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ گانا تو عربی زبان میں تھا جو ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ ایک مخصوص زاویے سے جب مختلف رنگ کی روشنی کی شعاعیں رقاصہ کے گداز بدن پر پڑتی تھیں تو حاضرین دل تھام کر رہ جاتے تھے۔

بابر کی نگاہیں رقاصہ کے بدن کی بجائے اس کے خوبصورت چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ رقاصہ کی نیلگوں آنکھوں سے روشنی کی شعاعیں سی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ دونوں اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اسٹیج بمشکل ان سے چند قدم کے فاصلے پر تھا اس لیے بابر کی نگاہ بار بار رقاصہ کی نگاہوں سے ٹکرا رہی تھی اور وہ اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو بابر کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے رقاصہ نگاہوں کی زبانی اسے کوئی پیام دے رہی ہو۔

مصر کے سحر کے متعلق اس نے بہت کچھ پڑھا تھا لیکن آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ رقاصہ کی آنکھوں سے پھوٹنے والی روشنی کی شعاعیں بابر کی آنکھوں سے گزر کر اس کے دل کی طرف پہنچ رہی تھیں اور اس کا دل بے اختیار رقاصہ کی طرف کھنچا جا رہا تھا لیکن وہ مجبور تھا بھرے ہال میں رقاصہ تک پہنچنا تقریباً ناممکن تھا۔ تاہم وہ دل ہی دل میں رقاصہ سے اکیلے ملنے کا تہیہ کر چکا تھا۔

پروگرام ختم ہونے کے بعد وہ روہیت کھنہ کو ساتھ لے کر واپس ہاسٹل پہنچ گیا۔ رات کافی بیت چکی تھی اس لیے وہ دونوں جلد ہی سو گئے۔ ذرا دیر بعد کمرے میں روہیت کھنہ کے خراٹے گونج رہے تھے مگر بابر کی نیند اڑ چکی تھی اس کے ذہن پر وہ رقاصہ بری طرح چھائی ہوئی تھی۔ آخر کار کروٹیں بدلتے بدلتے اسے نیند ہی آ گئی لیکن رقاصہ پھر بھی اس کے ذہن سے نہیں اتری تھی۔ وہ نیند میں بھی اسے ناچتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

دوسری صبح بابر کافی دیر سے جاگا تھا اگر روہیت کھنہ اسے نہ جگاتا تو شاید وہ دوپہر تک سویا ہی رہتا۔ نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے اسے اپنی طبیعت ست اور سر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ دوبارہ سو جائے لیکن مہمان نوازی کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ جلدی سے اٹھا اور باتھ روم میں گھس گیا۔ ایک بھرپور شاور لینے کے بعد اس کی طبیعت کی کسلمندی کافی حد تک دور ہو گئی تھی۔

ناشتا ان دونوں نے اکٹھے ہی کیا تھا۔ بابر نے روہیت کمنہ کا ساتھ دینے کے لیے یونیورسٹی سے چند روز کی مزید چھٹیاں لے لی تھیں۔ بابر کے استفسار پر روہیت کمنہ نے سب سے پہلے ابوالہول کو دیکھنے اور شوٹ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ شاید وہ اپنی ویڈیو فلم کا آغاز ہی سنسنی خیز انداز میں کرنا چاہتا تھا۔ تبھی سب سے پہلے اس نے ابوالہول جیسے پراسرار اور ہیبت ناک بت کو فلمانے کا پروگرام بنایا تھا۔

یونیورسٹی کے سامنے سے انہوں نے ٹیکسی پکڑی اور مقام ابوالہول کی طرف روانہ ہوگئے۔ اہرام کے قریب ہی ابوالہول کا بت واقع تھا۔ انہوں نے کرایہ ادا کر کے ٹیکسی ڈرائیور کو فارغ کیا اور ابوالہول کی طرف بڑھ گئے۔

بت کے آس پاس ملکی اور غیر ملکی سیاح کافی تعداد میں گھوم رہے تھے۔ چند ایک سیاح بت کی تصویریں بھی اتار رہے تھے۔

روہیت کمنہ ابوالہول کے بت کو مرعوبیت اور تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ بت کا قریب قریب پورا دھڑ زمین کے اندر دھنسا ہوا تھا تاہم گردن، سر اور دونوں ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔ بت کے چہرے پر کوئی سرخ رنگ کا خاص روغن ملا ہوا تھا۔ جو دھوپ میں چمک رہا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ ہزاروں برس گزر جانے کے باوجود بت کے چہرے کی آب و تاب قائم تھی۔ بت کے کھلے ہوئے اعضاء دیکھ کر بہ آسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ بت کا اصل قد ساٹھ ستر گز سے کسی طرح کم نہیں ہوگا۔ اس قد درازی قد کے باوجود بت کے اعضاء میں جو غیر معمولی تناسب پایا جاتا تھا وہ قابل تحسین تھا۔ ہاتھ، کان، آنکھیں، ناک، ہونٹ الغرض کسی عضو میں بھی باہم تناسب کے لحاظ سے بال برابر کا فرق نہیں تھا۔

روہیت کمنہ نے بڑی مشکل سے خود کو بت کے سحر سے آزاد کیا اور ویڈیو کیمرہ سنبھال کر بت کے اور آس پاس کے دوسرے مناظر فلمانے میں مصروف ہوگیا۔

بابر اس سے بھرپور تعاون کر رہا تھا۔ عرب سیاحوں کو بابر اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں سمجھا تا رہا تھا جب کہ غیر ملکی سیاحوں کو سمجھانے کے لیے انگریزی زبان کا سہارا لے رہا تھا۔

سیاحوں کے ہجوم میں گھومتے ہوئے بابر کے دل میں عجیب سی خواہش نے انگڑائی لی کہ کاش گزشتہ رات والی رقاصہ کہیں نظر آ جائے تو بے چین دل کو قرار آ جائے۔ اس نے زندگی میں بے شمار حسین لڑکیاں دیکھی تھیں مگر کسی نے بھی اس مصری ساحرہ کی طرح اسے متاثر نہیں کیا

تھا ویسے بھی دل ہارنے کے لیے ایک لمحے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ لمحہ گزشتہ رات اس پر گزر چکا تھا۔

اچانک عقب سے کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے چونک کر گردن گھمائی اور دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ گزشتہ رات والی رقاصہ اس کے سامنے تھی۔ اتنی جلدی بھی کسی کی خواہش پوری ہوسکتی ہے؟ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر مسکرا کر بولا" آپ .....اور یہاں کہیں یہ خواب تو نہیں ہے؟"

یہ جملہ اس نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں ادا کیا تھا مگر رقاصہ کا جواب سن کر ایک بار پھر اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ رقاصہ نے انگریزی میں جواب دیا تھا۔" جناب! خواب دن کے وقت چلتے پھرتے نہیں دیکھے جاسکتے۔"

وہ ایک ادا سے مسکرائی۔" کیا انگلش بولنے پر پابندی ہے؟"۔

"نن.....نہیں..... میں نے یہ تو نہیں کہا۔" وہ ایکدم ٹپٹا گیا۔ شاید اس مصری ساحرہ کا رعب حسن تھا کہ بابر کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔ ذرا دیر بعد وہ دونوں ایک خوبصورت سے ریسٹورنٹ میں بیٹھے کولڈ ڈرنک سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

مصری رقاصہ نے اسے اپنا نام انطونیہ بتایا تھا اور نائٹ کلب میں ناچنا شوق تھا۔ تاہم بابر کو اس کا یہ شوق کچھ اچھا نہیں لگا تھا جس کا اظہار اس نے سرہلا کر کیا۔"انطونیہ! مجھے آپ کا یہ شوق کچھ اچھا نہیں لگتا۔ آپ کوئی سروس وغیرہ کیوں نہیں کرلیتیں۔ ناچنے کے علاوہ دنیا میں کرنے کے لیے اور بھی بہت سے کام ہیں۔"

" کافی بے ہودہ شوق ہے۔" بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا اور انطونیہ ناگوار نگاہوں سے اسے گھورنے لگی۔

" سوری آئی ایم رئیلی سوری، مجھے آپ کی نجی زندگی میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔" غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ معذرت طلب انداز میں بولا۔

انطونیہ نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔" میں آپکی درخواست پر غور کروں گی۔ آپ پہلے مرد ہیں جو میرے بارے میں ایسا سوچتے ہیں۔"

اس کے بعد انطونیہ نے بابر کی درخواست پر فلم کی عکس بندی میں بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔ روہیت کمنہ نے انطونیہ اور بابر کے بھی چند سین یادگار کے طور پر فلما لیے تھے۔ مگر انطونیہ کو

روہیت کمنہ کی یہ جسارت پسند نہیں آئی تھی تاہم بابر کا لحاظ رکھتے ہوئے اس نے روہیت کمنہ کی یہ حرکت معاف کردی تھی۔ انطونیہ سے رخصت ہوتے وقت بابر نے اس سے پھر ملاقات کا وعدہ لے لیا تھا۔

زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کے لیے بابر کا دل اس انداز میں دھڑکا تھا اور وہ بھی وطن سے اتنی دور مگر یہ بھی تو سچ ہے نا! کہ محبت فاصلوں کی پابند نہیں ہوتی۔ رنگ، نسل، ذات پات، مذہب کچھ بھی تو نہیں دیکھتی اسی لیے تو محبت کو اندھا کہتے ہیں۔

روہیت کمنہ اسے انطونیہ میں دلچسپی لیتے دیکھ چکا تھا مگر فی الحال بابر سے اس موضوع پر بات کرنا اس نے نامناسب خیال کیا تھا۔ انتہائی حسین ہونے کے باوجود روہیت کمنہ کو انطونیہ کی شخصیت میں پراسراریت کے علاوہ کچھ ادھورا پن محسوس ہوا تھا۔ ایک ایسا ادھورا پن جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔

ہاسٹل پہنچنے کے بعد بابر کافی دیر تک انطونیہ کی تعریف میں رطب اللسان رہا تھا البتہ روہیت کمنہ کے انداز سے بیزاری عیاں ہو رہی تھیں شاید انطونیہ کی شخصیت اسے پسند نہیں آئی تھی۔

بابر نے اس کی اکتاہٹ محسوس کرتے ہوئے گفتگو کا موضوع بدل دیا تھا۔ اب وہ روہیت کمنہ کے ساتھ کل کا پروگرام ترتیب دینے میں مصروف ہو چکا تھا۔ کل کے پروگرام میں روہیت نے سرفہرست اہرام مصر کو رکھا تھا۔

☆☆☆

خلاف توقع دوسرے دن بابر کی آنکھ روہیت کمنہ سے پہلے کھل گئی تھی۔ رات بھر وہ انطونیہ کے متعلق قسم قسم کے خواب دیکھتا رہا تھا۔ کبھی وہ انطونیہ کے ساتھ کسی پارک میں گھوم رہا تھا تو کبھی کسی شاپنگ سنٹر میں۔

مصری ساحرہ کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ جاگنے کے بعد بابر کا دل بے اختیار انطونیہ سے ملنے کے لیے مچل اٹھا مگر روہیت کمنہ کے ساتھ جانا بھی ضروری تھا ورنہ وہ برا مناتا تاہم بابر دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ گزشتہ روز کی طرح آج بھی انطونیہ کہیں سر راہ ٹکرا جائے۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد وہ کمرے سے باہر نکلے اور یونیورسٹی کے صدر دروازے کی طرف چل پڑے۔ بابر بادل نخواستہ روہیت کمنہ کا ساتھ دے رہا تھا ورنہ تو

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کوئی بہانہ بنا کر رک جائے۔ اسے انطونیہ کی آمد کی توقع تھی۔

"یہ تم آج کچھ بجھے بجھے سے نظر آ رہے ہو، بات کیا ہے؟" روہیت کمنہ نے اسے پژمردہ دیکھ کر سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"نہیں... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے زبردستی کی مسکراہٹ کا سہارا لیتے ہوئے جواب دیا۔

"لگتا ہے تمہیں انطونیہ سے محبت ہو گئی ہے؟"

"شاید..... تم ٹھیک کہتے ہو۔" اس کے انداز سے مایوسی جھلک رہی تھی۔

جونہی وہ یونیورسٹی کے صدر دروازے سے باہر نکلے انطونیہ انہیں ٹکرا گئی۔ بابر اسے دیکھ کر ایکدم کھل اٹھا، اس کی ساری پژمردگی ایک لمحے میں ہوا ہو گئی البتہ روہیت کمنہ انطونیہ کو دیکھ کر بے زاری کا شکار ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بابر اب اس کا ساتھ دینے کی بجائے انطونیہ کے ساتھ چلا جائے گا اور اس کا شوٹنگ پروگرام التواء کا شکار ہو جائے گا۔

اس کا یہ اندیشہ اس وقت سچ ثابت ہو گیا جب بابر اس سے معذرت طلب کر کے انطونیہ کے ساتھ چلا گیا۔ روہیت کمنہ نے دل ہی دل میں انطونیہ کو جی بھر کر کوسا اور پھر ٹیکسی روک کر اکیلا ہی اہرام کی طرف روانہ ہو گیا۔ محض بابر کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہ اپنا کام ادھورا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اسے فلم مکمل کر کے جلد از جلد واپس انڈیا بھی پہنچنا تھا۔

بابر انطونیہ کے ساتھ گھومتے پھرتے اس سرکاری باغ کی طرف نکل گیا جو 1835ء میں محمد علی پاشا نے بنوایا تھا۔ یہ سرکاری باغ کئی میل لمبا چوڑا ہے۔ قاہرہ کا مشہور میوزم بھی اسی باغ کے اندر واقع ہے۔ یہ میوزم بے شمار کمروں پر مشتمل ہے۔ ان کمروں میں قبل از مسیح کی کئی یادگاریں موجود ہیں۔ جن میں طشتریاں، پیالے، مرتبان اور اس کی قسم کے دیگر سینکڑوں برتن رکھے ہوئے ہیں جو ہزاروں برس پہلے کے ہیں۔

سب سے عجیب وغریب اور محیر العقل وہ لاشیں ہیں جو ہزاروں سال پرانی ہونے کے باوجود اپنی اصل شکل اور ہیئت کے ساتھ موجود ہیں۔ ان حنوط شدہ لاشوں کو عربی زبان میں "موسیائی" اور انگلش میں "ممی" کہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ قدیم مصریوں کا یہ دستور تھا کہ وہ لکڑی یا پتھر کو کشتی کی صورت میں تراش کر مردوں کی لاشیں ان میں رکھ لیتے تھے۔ لاش پر ایک خاص قسم کا مسالہ لگا دیا جاتا تھا

اس طرح وہ گلنے سڑنے سے محفوظ رہتی تھی۔ لاش کے اردگرد خالی جگہ میں چونا بھر دیا جاتا تھا اور تابوت بند کر کے اوپری سطح پر مردے کی تصویر بنا دی جاتی تھی۔

حوادث زمانہ کے ساتھ ساتھ بہت سے تابوت کھل گئے ہیں۔ اوپر کا مسالہ اور چونا اکھڑ گیا ہے جس کی وجہ سے سالم لاشیں نظر آتی ہیں لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ ہزاروں برس گزر جانے کے باوجود بھی کھلی ہوئی لاشیں اپنی اصل شکل میں موجود ہیں۔ کسی بھی لاش میں بوسیدگی کا ذرا سا اثر بھی نظر نہیں آتا حتیٰ کہ سر کے بال اور ناخن تک اپنی اصلی حالت میں قائم ہیں۔

بابر اور انطونیہ اس وقت سرکاری باغ میں ایک سنگی بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انطونیہ کی موجودگی میں بابر خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اس کے قرب کا نشہ اس کی نس نس میں سرایت کر رہا تھا انطونیہ کے بدن سے اٹھنے والی مہک سے وہ مدہوش ہوا جا رہا تھا۔ اس دوسری ملاقات میں وہ بے تکلف ہو چکے تھے۔

''انطونیہ! چلو میوزم کے اندر چلتے ہیں۔'' اچانک بابر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''نن..... نہیں پھر کسی وقت جائیں گے۔ ویسے بھی میوزم میں لاشوں کے علاوہ رکھا کیا ہے؟'' انطونیہ نے بوکھلا کر جواب دیا اور بابر چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہے؟'' انطونیہ نے اپنے اندرونی اضطراب پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''انطونیہ!'' وہ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''کیا واقعی تمہیں مجھ سے محبت ہے؟''

''کیوں؟ تمہیں کوئی شک ہے کیا؟ میں نے تو.....''

اچانک وہ بات ادھوری چھوڑ کر اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک لمحے میں اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے میوزم کے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بابر نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو تین آدمی دوڑتے ہوئے ان کی طرف آ رہے تھے۔

''انطونیہ! کون لوگ ہیں یہ.....؟ تم کچھ خوفزدہ نظر آ رہی ہو؟'' بابر نے اسے پکارا لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس دوران وہ تینوں آدمی ان کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ان کے تیور خطرناک نظر آ رہے تھے اور وہ کینہ توز نگاہوں سے انطونیہ کو گھور رہے تھے۔

''کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟'' بابر نے درشت لہجے میں پوچھا لیکن ان میں سے کسی نے بھی جواب نہ دیا وہ تینوں انطونیہ کو حصار میں لیے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

انطونیہ نے ایک نظر بابر کی طرف دیکھا اور چلا کر بولی۔ ''بابر تمہیں مداخلت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بس اتنا جان لو کہ یہ تینوں میری جان کے دشمن ہیں۔ میرے چچا کے بھیجے ہوئے کرائے کے غنڈے ہیں۔ میں خود ہی ان سے نمٹ لوں گی۔ تم یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔''

انطونیہ کی بات سن کر بابر بھاگنے کی بجائے ان میں سے ایک پر جھپٹ پڑا اور اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اس کے پیٹ میں یکے بعد دیگرے تین بھرپور گھونسے جڑ دیئے۔

بابر کے اس غیر متوقع حملے نے اسے بوکھلا دیا تھا۔ اس کے منہ سے ایک کراہ نکلی اور وہ عربی زبان میں بے تحاشا بابر کو گالیاں دینے لگا۔ اس کے بقیہ دو ساتھیوں نے اسے چھڑانے کی بجائے انطونیہ پر بیک وقت چھلانگ لگا دی۔ انطونیہ پہلے ہی تیار تھی۔ وہ اپنی جگہ سے کسی ماہر فائٹر کی طرح اچھلی اور دونوں حملہ آوروں کے سر کے اوپر سے گزرتی ہوئی ان کے عقب میں جا کھڑی ہوئی۔ دونوں حملہ آور اپنے ہی زور میں ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔

بے تحاشا ان دونوں کی زبان سے انطونیہ کے لیے گالیوں کی بوچھاڑ نکلی لیکن ان کے اٹھنے اور سنبھلنے تک انطونیہ غائب ہو چکی تھی تاہم بابر ان کے تیسرے ساتھی کی دل کھول کر مرمت کر رہا تھا۔

دونوں نے دوڑ کر اپنے ساتھی کی جان بچائی اور بابر کو پکڑ لیا۔ دوسرے ہی لمحے بابر کے ہاتھوں میں پشت کی طرف سے ہتھکڑی لگا دی گئی۔ بابر ابھی تک انہیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ تینوں مصری خفیہ ایجنسی کے اہلکار ہیں تو وہ ایکدم بوکھلا گیا اور ان کی منت سماجت کرنے لگا مگر انہوں نے بابر کی ایک نہ سنی اور اسے دھکیلتے ہوئے ایک طرف چل دیئے۔

تفتیش کے دوران بابر اپنے آپ کو بے گناہ اور الازہر یونیورسٹی کا طالب علم ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن خفیہ ایجنسی کے سربراہ نے اسے رہا کرنے کی بجائے وہاں کی مقامی پولیس کے حوالے کر دیا۔

تھانے کا انچارج ایک درشت صورت بھدے نقوش کا مالک تھا۔ جو عربی لہجے میں

ٹوٹی پھوٹی انگلش بول لیتا تھا۔ پوچھ گچھ کے دوران بابر نے اسے اپنے متعلق سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتادیا البتہ انطونیہ کے متعلق اسے کچھ خاص علم نہیں تھا اس لیے اس کا نام اور کام بتانے کے بعد اس نے تھانہ انچارج سے معذرت کرلی تھی۔

بابر کی ساری گفتگو سننے کے بعد تھانہ انچارج نے ناگوار انداز میں اسے گھورا اور پھر اپنی فرنچ کٹ داڑھی کو کھجاتے ہوئے بولا۔ ''تم جھوٹ بول رہے ہو، تمہیں انطونیہ کا ٹھکانہ معلوم ہے؟''

''میں کوئی مجرم نہیں ہوں جناب کہ جھوٹ بولوں گا، ایک طالب علم ہوں اور وہ بھی الازہر یونیورسٹی کا۔'' بابر نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔

''بقول تمہارے اگر تم الازہر یونیورسٹی کے طالب علم ہو تو پھر ابھی تک کوئی تمہاری ضمانت کے لیے کیوں نہیں آیا؟'' تھانہ انچارج نے اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

بابر نے کہا۔ ''انہیں کیا معلوم کہ میں یہاں ہوں۔''

تھانہ انچارج سامنے پڑے ہوئے فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''تم فون کرسکتے ہو، پاکستانی......!

بابر نے فون کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''پاکستان میرا وطن ہے اور وطن ہر کسی کو عزیز ہوتا ہے۔ آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میرے وطن کے بارے میں غلط بولیں البتہ مجھ پر ایک بات واضح ہوگئی ہے کہ قانون ہر جگہ اندھا ہے''

تھانہ انچارج بولا۔ ''میری نرمی کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔ جس کسی کو بھی فون کرنا ہے جلدی کرو ورنہ رات حوالات میں گزارنا پڑے گی۔''

''اسے فون کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں آ گیا ہوں۔'' اچانک دروازے سے بارعب نمودار ہوا اور بابر اسے دیکھ کر کھل اٹھا۔ وہ پروفیسر شیخ محمد عبداللہ ابن سلیمان تھے۔ قاہرہ الازہر یونیورسٹی کی معروف شخصیت۔ فوری طور پر قانونی کارروائی مکمل کرلی گئی اور پروفیسر بابر کو لے کر چلا گیا۔

''سر، آپ نے اس پاکستانی نوجوان کو انطونیہ کے بارے میں آگاہ کیوں نہیں کیا؟'' بابر اور پروفیسر کے باہر نکلتے ہی تھانہ انچارج سے ایک کانسٹیبل رینک کے آدمی نے

سوالیہ انداز میں پوچھا۔

تھانہ انچارج نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر درشت لہجے میں بولا۔ ''تو کیا چاہتا ہے کہ یہ نوجوان اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بے وقوف آدمی جب تک انطونیہ کے بارے میں لاعلم ہے محفوظ ہے۔''

''سر! یہ انطونیہ خوبصورت نوجوانوں کو قتل کیوں کرتی ہے؟'' کانسٹیبل نے دوبارہ سوال کیا۔

''بے خبر رہو تو بہتر ہے ورنہ تم بھی انطونیہ کے ہاتھوں وہیں پہنچ جاؤ گے جہاں تم سے پہلے چھ نوجوان پہنچ چکے ہیں۔'' تھانہ انچارج نے ذومعنی انداز میں جواب دیا اور کانسٹیبل کے چہرے کا رنگ زرد ہو کر رہ گیا۔

☆☆☆

''یونیورسٹی میں کسی سے بھی اس واقعے کا ذکر مت کرنا مجھ سے بھی نہیں، سمجھ گئے؟'' تھانے سے باہر نکلتے ہی پروفیسر شیخ محمد عبداللہ ابن سلیمان نے اسے تاکید کرتے ہوئے کہا۔

''مگر کیوں سر؟ میں نے کوئی جرم تو نہیں کیا ہے جو خاموش رہوں۔'' بابر نے احتجاج کیا۔

''لوگ صرف باتیں بنانا جانتے ہیں۔'' پروفیسر ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولے۔ ''یہاں بے گناہ اور گناہگار کو کون دیکھتا ہے۔ تمہاری تعلیم کا حرج ہوگا۔ اپنے ساتھ اپنے ملک کو بھی بدنام کرو گے۔ جو کچھ ہوگیا ہے اسے برا سپنا سمجھ کر بھول جاؤ یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ زیادہ سوچو گے تو پریشانیاں بڑھیں گی چپ چاپ ہاسٹل پہنچ جاؤ اور معمول کے مطابق اپنے کام سرانجام دیتے رہو۔ روبیت سے بھی واقعہ کا تذکرہ مت کرنا''۔

پروفیسر کی بات معقول تھی اس لیے بابر نے بلا چوں چرا اس مان لی تھی۔ تھوڑی دور جاکر پروفیسر نے اس سے اجازت طلب کی اور ایک ٹیکسی پکڑ کر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ بابر کچھ دیر تو پیدل چلتا رہا اور انطونیہ کے متعلق سوچتا رہا۔ جوں جوں وہ انطونیہ کے بارے میں سوچتا گیا اس کا ذہن الجھتا گیا۔ مختلف قسم کے سوالات اسے پریشان کرنے لگے۔ انطونیہ کون ہے؟ خفیہ ایجنسی کے اہلکار کیوں اسے پکڑنا چاہتے تھے؟ انطونیہ کا کوئی چچا ہے بھی یا وہ جھوٹ بول رہی تھی؟

ایسے ہی نجانے کتنے سوالات تھے جو اس کے دماغ میں کلبلا رہے تھے۔ اس اابھی

ہوئی ڈور کا کوئی سرا اس کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ بقول شاعر

ہاتھ الجھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھے ہیں
اب بتا کون سے دھاگے کو جدا کس سے کریں

یونہی سوچتے سوچتے اس پر ایکدم جھنجھلاہٹ طاری ہوگئی۔ یکایک ایک ٹیکسی اس کے قریب پہنچ کر رکی اور وہ چونک کر ٹیکسی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دوسرے ہی لمحے انطونیہ ٹیکسی سے مسکراتے ہوئے اتری اور بابر کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ ''ہیلو! بابر کیسے ہو؟'' انطونیہ نے یوں مسکرا کر سوال کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

ایک لمحے کے لیے تو بابر الجھ کر رہ گیا۔ اسے کوئی جواب ہی نہیں سوجھ رہا تھا بس انطونیہ پر غصہ آ رہا تھا جو اسے مصیبت میں ڈال کر خود رفو چکر ہوگئی تھی۔ پھر معاً ایک خیال برق کی طرح اس کے دماغ میں کوندا۔ کہ اس نے جب بھی انطونیہ کے متعلق سوچا تھا وہ فوراً پہنچ گئی تھی اور ایسا ایک بار نہیں تین بار ہو چکا تھا۔

''تو کیا انطونیہ کوئی پراسرار ہستی ہے یا پھر محض محض اتفاقاً ہر بار ایسا ہو جاتا ہے؟'' اس نے دل ہی دل میں سوچا مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔

''میں جانتی ہوں تم کیا سوچ رہے ہو؟'' اسے پریشان دیکھ کر انطونیہ نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''تم انتہا درجے کی جھوٹی ہو۔'' وہ ناگوار لہجے میں بولا۔ ''وہ لوگ خفیہ ایجنسی کے اہلکار تھے جنہیں تم اپنے چچا کے بھیجے ہوئے غنڈے بتا رہی تھی جب کہ تم قانون سے بھاگی ہوئی ایک مجرم ہو۔ وہ لوگ مجھ سے تمہارا ٹھکانہ بلاوجہ تو نہیں پوچھ رہے تھے۔''

''میرا چچا بہت عیار شخص ہے بابر۔'' انطونیہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ''میں جب بھی کسی نوجوان کے متعلق سنجیدہ ہوئی ہوں وہ اسے مجھ سے متنفر کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتا ہے مجھے معلوم ہے کہ اس نے تمہارے کان بھی خوب بھرے ہوں گے۔ دراصل وہ .....''

''تمہارا چچا کو میں نے دیکھا کب ہے'' بابر نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

انطونیہ نے کہا۔ ''اسی نے تو تمہیں گرفتار کروایا تھا۔ مصری خفیہ ایجنسی کا چیف ہی میرا چچا ہے۔''

''کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟'' اس نے متحیر لہجے میں پوچھا۔

''مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا چچا میری کروڑوں کی جائیداد ہتھیانا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ کسی بھی نوجوان سے میرا میل جول پسند نہیں کرتا مبادا میں اس سے شادی کرلوں اور چچا کو کروڑوں کی جائیداد سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں۔''

بابر نے کہا کہ۔ ''لیکن میں نے کبھی بھی تم سے شادی کرنے کا ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ پھر تمہارا چچا میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے؟''

انطونیہ نے کہا۔ ''وہ بہت چالاک ہے اس لیے امکانات کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہتا۔ اسے یہ تو معلوم نہیں ہے کہ نا! کہ تمہارے اور میرے درمیان صرف دوستی کا رشتہ ہے۔ وہ اپنے نکتہ نگاہ سے دیکھتا ہے اس لیے اسے ہر نوجوان میری شادی کا امیدوار نظر آتا ہے۔''

''اچھا کیا جو تم نے مجھے سب کچھ سچ سچ بتایا ورنہ تمہارے چچا کی باتیں سن کر میں تمہیں کوئی ملک دشمن قسم کی شخصیت سمجھنے لگا تھا''

انطونیہ نے مطمئن انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''اب تو تمہاری غلط فہمی دور ہوگئی ہے نا! کہ میرا چچا جھوٹ بولتا ہے؟''

بابر نے جواب دیا۔ ''کس حد تک، لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ تم موقع سے فرار کیسے ہوگئی تھیں؟''

انطونیہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''میں اگر وہاں سے فرار نہ ہوتی تو اس وقت ہم دونوں حوالات میں پڑے ہوتے۔ تمہیں چھڑانے کے لیے پروفیسر کو میں نے ہی تو تھانے بھیجا تھا۔''

بابر نے کہا۔ ''میں تمہارا شکرگزار ہوں کہ تم نے میرے لیے اتنا کچھ کیا بہرکیف اب میں چلوں گا روحیت میرا انتظار کر رہا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ اجازت طلب انداز میں بولی۔ ''کل ملیں گے۔ اپنے چچا کے متعلق میں تمہیں اور بھی کچھ بتاؤں گی۔ فی الحال تم اس واقعے کا ذکر کسی سے مت کرنا خواہ مخواہ تمہاری بدنامی ہوگی۔''

انطونیہ کے جانے کے بعد بابر نے ایک ٹیکسی پکڑی اور یونیورسٹی ہاسٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔ روحیت اس سے پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ بابر نے اس سے اہراموں کی عکس بندی کے متعلق تھوڑا بہت دریافت کیا اور پھر شاور لینے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔ سارے دن کی

تھکاوٹ اتارنے کے لیے غسل بہت ضروری تھا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بابر نے تھوڑی دیر روہیت کمنہ سے گپ شپ لگائی اور پھر ایکدم سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا ''یار! یہ انطونیہ تمہیں کیسی لڑکی لگتی ہے؟''

''سچ بتاؤں؟'' روہیت نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

روہیت نے کہا کہ ''انطونیہ جیسی نظر آتی ہے ویسی ہے نہیں۔ مجھے تو وہ بالکل کوئی بھٹکی ہوئی آتما لگتی ہے۔''

بابر بولا۔ ''پراسرار تو وہ مجھے بھی لگتی ہے لیکن یہ آتما والا چکر میں نہیں مانتا۔ ہمارے مذہب میں مرنے کے بعد انسان کا مادی دنیا سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا البتہ یہ بات کس حد تک درست ہو سکتی ہے کہ وہ کوئی ساحرہ وغیرہ ہو۔''

''ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے لیکن ہمیں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ وہ واقعی کوئی بدکار آتما ہو اور اپنی تشنہ آرزوؤں کی تکمیل کے لیے دوبارہ اس دنیا میں آگئی ہو۔''

بابر بولا۔ ''میں تمہاری اس بات سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ نیک و بدروحیں صرف عالم ارواح میں رہتی ہیں اور ویسے بھی انسان کے مرنے کے بعد اس کی آرزوؤں کی بھی موت ہو جاتی ہے۔''

''ہمارے پاس انطونیہ کی حقیقت جاننے کے لیے ایک ذریعہ موجود ہے۔'' روہیت کمنہ نے پرجوش لہجے میں کہا اور بابر چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ بابر کی نگاہوں کا استفسار بھانپتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں یاد ہوگا کہ ابوالہول کی فلم بندی کے دوران میں نے تمہارے اور انطونیہ کے چند مناظر فلمائے تھے۔ ہم ویڈیو فلم کا وہ حصہ دیکھ کر با آسانی انطونیہ کی حقیقت معلوم کر سکتے ہیں۔''

بابر بولا۔ ''میں تمہارے اس شک کا مطلب سمجھ گیا ہوں لیکن انطونیہ جادو کے زور سے بھی تو کیمرے کی آنکھ سے اوجھل ہو سکتی ہے۔''

''پھر بھی ویڈیو فلم دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ کم از کم ہمیں یہ تو پتا چل جائے گا کہ انطونیہ عام لڑکی ہے یا پھر پراسرار ہستی؟'' روہیت نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

روہیت کی بات میں وزن تھا اس لیے بابر اس سے متفق ہو گیا۔ تھوڑی سی تگ و دو

کے بعد بابر ہاسٹل کے ریکریشن روم سے ٹی وی اور وی سی آر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

دوسرے اسٹوڈنٹس کی مداخلت کے پیش نظر انہوں نے اندر سے اپنے کمرے کو لاک کرنے کے بعد ٹی وی، وی سی آر کو سیٹ کیا اور پھر روہیت کمنہ نے ویڈیو کیمرے سے کیسٹ نکال کر وی سی آر میں ڈالنے کے بعد (Rew) کا بٹن پریس کر دیا۔ جونہی کیسٹ ریورس ہوئی روہیت کمنہ نے ٹی وی آن کر کے پلے کا بٹن دبا دیا۔

دوسرے لمحے سکرین پر ابوالہول کا بت نظر آنے لگا۔ اردگرد کے مناظر اور سیاحوں کی متحرک تصاویر دیکھ کر ان دونوں کا دل بڑی تیزی کے ساتھ دھڑک رہے تھے۔ کچھ لمحوں میں انطونیہ کا پول کھلنے والا تھا۔

پھر جب بابر اسکرین پر نمودار ہوا تو ان دونوں کی نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ انطونیہ اسکرین سے غائب تھی البتہ بابر کسی نادیدہ ہستی سے باتیں کرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''دیکھ...... دیکھ لو میرا شک صحیح نکلا؟'' روہیت نے خوف زدہ لہجے میں سوال کیا۔ بابر نے جواب دینے کی بجائے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ٹی وی سیٹ آف کر دیا۔

روہیت بے حد پریشان نظر آ رہا تھا۔ ''اب ہم دونوں بری طرح پھنس گئے ہیں میرے دوست۔'' وہ مردہ سی آواز میں بولا لیکن بابر نے کوئی جواب نہیں دیا اس کا چہرہ سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اچانک وہ کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولا۔ ''روہیت مجھے نہیں معلوم کہ انطونیہ بقول تمہارے کوئی بھٹکی ہوئی روح یا پھر ساحرہ مگر ایک بات طے ہے کہ وہ ایک پراسرار ہستی ہے۔''

روہیت نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''تت...... تم...... جا...... جانو...... اور انطونیہ میں کل...... واپس انڈیا جا رہا ہوں...... مجھے تمہارے ساتھ نہیں مرنا۔''

''پاگل مت بنو۔'' بابر جھنجھلا کر بولا۔ ''انطونیہ نے جو کچھ کرنا ہے میرے ساتھ کرنا ہے۔ تم اپنے کام میں لگے رہو میں خود اس سے نبٹ لوں گا۔''

☆☆☆

دوسرے دن بابر سب سے پہلے پروفیسر شیخ محمد عبداللہ بن سلیمان سے ملا اور اس سے گزشتہ شام والے واقعے کا ذکر کیا تو وہ متحیر انداز میں بابر کی شکل دیکھنے لگا ''برخوردار!''

پروفیسر سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "تم کل شام کی بات کرتے ہوئے مگر میں تو تمہاری شکل میں تین دن کے بعد دیکھ رہا ہوں۔"

"لیکن سر! میں نے آپ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ آپ نے ہی عین موقع پر پہنچ کر میری ضمانت دی تھی اور پھر مجھے منع بھی کر دیا تھا کہ میں اس بات کا تذکرہ کسی بھی نہ کروں۔" اس نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"مجھے تم کچھ پریشان نظر آتے ہو، تمہارے ساتھ پرابلم کیا ہے؟ مجھے بتاؤ شاید میں تمہاری کچھ مدد کرسوں۔"

پروفیسر نے شفقت آمیز لہجے میں پوچھا تو بابر کی کچھ ڈھارس بندھی اور اس نے بلا کم وکاست پوری سرگزشت پروفیسر کو سنا ڈالی۔

بابر کی کہانی سن کر ایک لمحے کے لیے تو پروفیسر پریشان ہو کر رہ گیا لیکن پھر اپنے اندرونی اضطراب پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "بیٹے! تم ایک شیطانی چکر میں پھنس چکے ہو۔ انطونیہ ایک ساحرہ ہے اور اپنے غلیظ مقاصد کے لیے عموماً خوبصورت نوجوانوں کو شکار کرتی ہے۔ کچھ عرصہ قبل چھ نوجوان یکے بعد دیگرے اس کی شیطانیت کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ مصری خفیہ ایجنسی اسے اسرائیلی جاسوسہ سمجھ کر کافی عرصہ سے اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ لیکن آج تک اسے پکڑنے میں ناکام رہی ہے۔ دراصل مصری خفیہ ایجنسی اس کی حقیقت سے ناواقف ہے اس لیے اسے اب تک نہیں پکڑ سکی۔"

"سر! کیا آپ اس کی حقیقت سے واقف ہیں؟" پروفیسر کے خاموش ہوتے ہی اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"میں اس کی حقیقت جانتے ہوئے بھی زبان کھولنے سے قاصر ہوں۔ تم نوجوان ہو ہمت کر کے اس سے پیچھا چھڑا سکتے ہو۔ اسے ختم کرنا نہایت آسان ہے لیکن کاش کہ میں تمہیں بتا سکتا۔ البتہ ایک مشورہ دے سکتا ہوں تم امام شافعی کے روضہ مبارک پر حاضری دو شاید قدرت کی طرف سے کچھ رہنمائی حاصل ہو جائے۔" پروفیسر نے معذرت خواہانہ انداز میں جواب دیا۔

"سر! کیا انطونیہ اتنی ہی خطرناک ہے کہ آپ اس کے بارے میں بتاتے ہوئے اتنا خوفزدہ ہو رہے ہیں؟"

"اتنی زیادہ کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے، بس اس سے زیادہ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔" پروفیسر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا سر جیسے آپ کی مرضی اب میں چلوں گا۔"

پروفیسر بولا۔ "میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا کروں گا۔"

اس نے پروفیسر سے اجازت طلب کی اور سیدھا ہاسٹل کا رخ کیا جہاں پر روہیت کو منتظر چھوڑ آیا تھا۔ آج انہوں نے میوزیم میں جانا تھا فلم بندی کے لیے اس لیے وہ تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔

ہاسٹل میں پہنچتے ہی اس نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ دور سے اپنے کمرے کے سامنے اسٹوڈنٹس کا جمگھٹا دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو وہ حیران رہ گیا مگر دوسرے لمحے سنسنی خیز ایک تیز لہر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔

"شاید کوئی انہونی ہو چکی ہے۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا اور اسٹوڈنٹس کو ہٹاتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے کا اندرونی منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی۔ روہیت کمنہ کی لاش چھت کے پنکھے کے ساتھ جھول رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک خوف سا ثبت تھا اور زبان لٹکی ہوئی تھی۔ اسٹوڈنٹس قسم قسم کی چہ مگوئیاں کر رہے تھے مگر وہ بت بنا روہیت کی لاش کو گھور رہا تھا۔ روہیت کی کھلی ہوئی آنکھوں میں بے پناہ خوف نظر آ رہا تھا۔ موت سے پہلے کا خوف...... زندگی جیسا قیمتی اثاثہ ہارنے کا خوف، ایک ایسا خوف جو رگوں کا لہو منجمد کر دیتا ہے۔

اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے روہیت کی آنکھوں کی پلکیں متحرک ہوگئی ہوں مگر یہ کیا...... یہ روہیت کی آنکھیں تو نہیں تھیں پھر کس کی تھیں......!

"بابر میں تجھے دیکھ رہی ہوں۔" اس کے کانوں میں ایک سرگوشی سی گونجی اور دل اس کے پہلو میں پارے کی طرح اچھلنے لگا۔ وہ حواس باختہ ہو کر دائیں بائیں دیکھنے لگا مگر کمرے میں چند تماشائی اسٹوڈنٹس کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

"ڈرو نہیں بابر......" سرگوشی دوبارہ گونجی "میں انطونیہ ہوں۔ روہیت کو میں نے نہیں مارا بلکہ اس نے خودکشی کی ہے میرا یقین کرو میں سچ کہہ رہی ہوں۔ آج رات تم اپنے کمرے سے باہر مت جانا۔ میں تم سے ملنے کے لیے آؤں گی اور تمہیں روہیت کی موت کا سبب بتاؤں

گی۔ کچھ لوگ تمہیں میرے متعلق گمراہ کرنے کی کوشش کریں گے مگر تم نے کسی کی بات کا یقین نہیں کرنا۔ سمجھ گئے نا؟'' سرگوشی نے آخری الفاظ حکمیہ لہجے میں ادا کیے تھے۔ بابر نے انطونیہ کی سرگوشی سن کر بے اختیار اثبات میں سر ہلا دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد یونیورسٹی انتظامیہ کو بھی روہیت کی پراسرار موت کے بارے میں معلوم ہوگیا۔ انتظامیہ نے بغیر کسی جھنجھٹ میں پڑے اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے روہیت کمنہ کی لاش فی الفور انڈین ایمبیسی کے حوالے کر دی اور یوں بابر کسی بھی تفتیش سے محفوظ رہا۔

روہیت کی پراسرار موت نے بابر کے اعصاب چٹخا کر رکھ دیئے تھے۔ لمحہ لمحہ خوف کے زہریلے ناگ اسے ڈس رہے تھے۔ اب وہ انطونیہ کے متعلق سوچتے ہوئے بھی خوف محسوس کر رہا تھا۔ گو کہ ساتھی اسٹوڈنٹس حتی المقدور اس کی دلجوئی کر رہے تھے مگر جوں جوں رات قریب آتی جا رہی تھی مارے خوف کے بابر کے پسینے چھوٹتے جا رہے تھے۔ اسے چاروں طرف سے انطونیہ کی آنکھیں گھورتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ کبھی کمرے کی کسی دیوار سے تو کبھی کمرے کی چھت سے دل ہی دل میں وہ وقت ٹھہر جانے کی دعائیں مانگ رہا تھا مگر وہ ظالم کب کسی کے روکے رکتا ہے اس کا تو کام ہی لمحہ لمحہ گزرتے رہنا ہے۔ اس کی رفتار میں اک ذرا سا فرق بھی نہیں آتا چاہے کوئی مرے یا جیئے۔

بابر کو رہ رہ کر اس مصری دست شناس کے الفاظ یاد آ رہے تھے جس نے قبل از وقت اسے آنے والے تکلیف دہ اور پراسرار حالات سے آگاہ کر دیا تھا مگر اس نے مصری کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

عصر کے وقت اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو وہ ایک طالب علم دوست کے ساتھ امام شافعی کے روضہ مبارک کی زیارت کے لیے چل دیا۔ روضہ مبارک کے احاطے میں زائرین کی کافی تعداد موجود تھی۔ بابر نے وہاں پہنچ کر صدق دل سے رو رو کر اللہ تعالی سے مدد کی فریاد کی تو حیرت انگیز طور پر اس کا خوف کم ہوگیا اور اس کی مضطرب طبیعت آہستہ آہستہ پرسکون ہونے لگی۔ شاید اللہ تعالی نے ایک برگزیدہ ہستی کے طفیل اس کی فریاد سن لی تھی۔ واپس ہاسٹل پہنچ کر اس نے ایک بھرپور شاور لیا اور لباس بدل کر بستر پر نیم دراز ہوگیا۔ خوف کا اثر زائل ہوا تو اس کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ اچانک ایک خیال برق کے کوندے کی طرح اس کے دماغ

میں لپکا اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

مسجد میں رات بسر کرنے والا یہ خیال یقیناً قدرت کی طرف سے رہنمائی کا واضح اشارہ تھا۔ نماز مغرب کے بعد اس نے ہاسٹل کے میس سے رات کا کھانا کھایا اور اندھیرا چھانے سے پہلے ہی وہ ہاسٹل کی مسجد میں پہنچ گیا۔ عشاء کی نماز نے اس باجماعت ادا کی تھی۔

ساڑھے نو بجے کے بعد مسجد کا احاطہ خالی ہو چکا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ تلاوت کلام پاک میں مشغول ہوگیا۔ تلاوت کلام پاک سے جہاں اسے سکون حاصل ہوا تھا وہاں اس کا خوف بھی بڑی حد تک کم ہوگیا تھا۔

اسے یقین تھا کہ وہ اللہ تعالی کے گھر میں کلی طور پر محفوظ ہے۔ کوئی بھی شیطانی طاقت مسجد میں گھسنے کی جرات نہیں کر سکتی تھی۔ شیطان لاکھ طاقتور سہی لیکن رحمان کے سامنے اس کی حیثیت ایک حقیر مچھر سے بھی کم ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ انطونیہ بھی شیطان کی آلہ کار ہے وہ اسے مسجد سے باہر رہ کر ڈرا سکتی تھی مگر مسجد کے اندر قدم نہیں رکھ سکتی تھی۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا جا رہا تھا۔ کلام پاک کی تلاوت کے بعد اب وہ نوافل پڑھنے میں مشغول ہو چکا تھا۔ تقریباً آدھی رات تک وہ نوافل پڑھتا رہا اور ساتھ ساتھ اللہ تعالی سے مدد کی فریاد بھی کرتا رہا۔

نوافل سے فارغ ہونے کے بعد اب وہ ذکر واذکار میں لگ گیا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر آنکھیں موندے ذکر میں مصروف تھا کہ معاً فضاء میں ایک فلک شگاف چیخ کی آواز گونجی اور وہ سرتا پا لرز اٹھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے آنکھیں کھول کر مسجد کے احاطے سے باہر نگاہ ڈالی مگر اسے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ سوائے ہولناک اندھیرے کے۔ چیخ کی آواز کے ساتھ ہی تیز ہوا چلنے لگی اور مسجد کے اردگرد کے درخت شائیں شائیں کی خوفناک آوازیں پیدا کرتے ہوئے جھومنے لگے۔ شدت خوف سے اس کے پسینے چھوٹتے جا رہے تھے لیکن حیرت انگیز طور پر ہوا مسجد کے احاطے میں داخل نہیں ہو رہی تھی۔ سیٹیاں بجاتی ہوئی ہوا سے ''انطونیہ، انطونیہ'' کی آواز آ رہی تھی مگر وہ جی کڑا کر کے ذکر میں مصروف رہا۔ وقفے وقفے سے اس کے کانوں میں مختلف ہولناک آوازیں پڑتی رہیں۔ کبھی کتوں کے رونے کی آوازیں تو کبھی بہت ساری بلیوں کے لڑنے کی خوفناک آوازیں۔

مصر کی ساحرہ اسے مسجد سے نکالنے کے لیے ہر حربہ آزما رہی تھی مگر بابر نے بھی

آنکھیں نہ کھولنے کا پکا تہیہ کر رکھا تھا۔ وہ بدستور آنکھیں موندے کانپتی لرزتی آواز میں مختلف قسم کی دعائیں اور ورد پڑھتا رہا اور رات آہستہ آہستہ اختتام کی طرف بڑھتی رہی۔ شب کے آخری پہر تو مسجد کے چاروں طرف سے ایسی دل ہلا دینے والی آوازیں آنے لگیں جیسے ہزاروں بدروحیں بین کر رہی ہوں۔ تمام آوازیں نسوانی تھیں۔

رونے اور ہنسنے کی خوفناک آوازیں سن کر ایک لمحے کے لیے تو اس نے مسجد سے بھاگنے کا ارادہ کر لیا۔ قریب تھا کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مسجد کے صدر دروازے کی طرف دوڑ پڑتا کہ اچانک ایک تحکمانہ آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ ''اگر زندگی سے پیار اور خدا تعالیٰ پر بھروسہ ہے تو مسجد کو مت چھوڑنا ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔''

تحکم کے ساتھ ساتھ اس آواز میں ایک شفقت اور تسلی بھرا انداز بھی موجود تھا۔ اس غائبانہ آواز سے کسی حد تک اس کی ڈھارس بندھ گئی۔ وہ اور تیزی کے ساتھ ذکر کرنے لگا۔ صبح کی اذان سے تھوڑی دیر قبل نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ مسجد کے احاطے میں لڑھک گیا۔ نیند کا حملہ اتنا شدید تھا کہ وہ ہر خوف سے بے نیاز ہو گیا۔

حالت خواب میں اس کے سامنے ایک باریش بزرگ ظاہر ہوئے جن کے نورانی چہرے سے روشنی کی کرنیں سی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ بزرگ نے اس سے پریشانی کا سبب دریافت کیا تو اس نے من و عن اسے سارا ماجرا سنا ڈالا۔

اس کی کہانی سن کر بزرگ نے تبسم آمیز لہجے میں فرمایا۔ ''بیٹے! تمہاری دشمن اپنے عہد کی ایک بہت بڑی ساحرہ تھی۔ فرعون رعمسیس دوئم کے عہد حکومت میں وہ باقاعدہ شاہی دربار کے ساتھ منسلک تھی۔ پھر کسی غلطی کی پاداش میں اسے زندہ حنوط کر کے تابوت میں بند کر دیا گیا تھا۔ تب سے لے کر آج تک وہ ہر صدی گزرنے کے بعد سرزمین مصر پر کہیں نہ کہیں ضرور جنم لیتی ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ وہ پیدائشی ساحرہ کے روپ میں جنم لیتی ہے اور پھر جوان ہونے کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے امر ہو جانے کے لالچ میں ابلیس کے سامنے خوبصورت نوجوانوں کی قربانی دینا شروع کر دیتی ہے۔ ابلیس کے کہنے کے مطابق جس جنم میں وہ سو نوجوانوں کی قربانی دینے میں کامیاب ہو جائے گی تب ہمیشہ کے لیے امر ہو جائے گی مگر ایسا قیامت تک نہیں ہونے والا۔''

''باباجی!'' بابر نے عاجزی سے سوال کیا۔ ''شیطان کی اس آلۂ کار کو ختم کرنے کا

کوئی نہ کوئی طریقہ کار تو ضرور ہو گا؟''

''ہاں اسے ختم کرنا بہت ضروری ہے۔'' بزرگ کے لہجے میں غصہ عود کر آیا۔ ''میں تمہیں ایک ایسی چیز دوں گا جس کے ذریعے تم اسے باآسانی ختم کر سکو گے۔'' اتنا کہہ کر بزرگ نے ایک سوئی نما باریک نوک والا آلہ اس کی ہتھیلی پر رکھا اور دوبارہ فرمانے لگے۔ ''بیٹے! تم کل پہلی فرصت میں قاہرہ کے عجائب گھر پہنچ جانا وہاں تمہیں ایک کھلے ہوئے تابوت میں وہ بدکار ساحرہ ممی کے روپ میں ملے گی۔ موقع ملتے ہی تم یہ سوئی نما آلہ اس ممی کے عین دل کے مقام پر رکھ کر دبا دینا۔ انشاء اللہ اس ساحرہ کا خاتمہ ہو جائے گا تاہم تمہیں یہ کام وہاں موجود لوگوں کی نظر بچا کر سرانجام دینا پڑے گا۔''

اس سے پہلے کہ وہ بزرگ سے مزید کوئی سوال کرتا اس کی آنکھ کھل گئی۔ غالباً صبح ہو گئی تھی کیونکہ مسجد میں موذن کی روح پرور صدا گونج رہی تھی۔ ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' الصلوٰۃ خیر من النوم'' اذان کی آواز سنتے ہی وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی مٹھی میں موجود وہ سوئی نما آلہ خواب کی صداقت اور خدائی امداد کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ اس کی زندگی کی بھیانک ترین رات گزر چکی تھی۔ سوئی نما آلے کو اس نے جیبی رومال میں لپیٹ کر دوبارہ جیب میں ڈالا اور وضو کرنے کے لیے چل دیا۔ صبح کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد اس نے دوبارہ دل کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ سے مدد کی دعا مانگی اور پُرمطمئن انداز میں مسجد کے صدر دروازے کی طرف چل دیا۔

دن کے تقریباً نو بجے وہ ہاسٹل سے باہر نکلا اور ایک ٹیکسی پکڑ کر میوزیم کی طرف روانہ ہو گیا۔ صبح کا وقت ہونے کی وجہ سے میوزیم میں کوئی خاص رش نہیں تھا۔ اس لیے وہ بغیر کسی دقت کا سامنا کیے اس ہال نما کمرے میں پہنچ گیا جہاں ممیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ہال میں اس وقت صرف چند افراد گھوم رہے تھے۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد بابر مطلوبہ ممی تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

ممی ایک کھلے ہوئے تابوت میں رکھی تھی جس کی صورت دیکھ کر بابر کی آنکھیں حیرت کے مارے پھٹی چلی گئیں۔ انطونیہ اور اس ممی کی شکل میں بال برابر بھی فرق نہیں تھا۔ وہی آنکھیں وہی ناک نقشہ وہی بالوں کا رنگ۔ ایک لمحے کے لیے تو بابر کو یوں محسوس ہوا جیسے تابوت میں زندہ انطونیہ لیٹی ہوئی ہو مگر یہ ڈرنے اور سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے رومال

میں لپٹی ہوئی سوئی باہر نکالی اور ایک ہوشیار سی نگاہ اپنے دائیں بائیں ڈالی مگر کوئی بھی شخص اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے سوئی ممی کے عین دل کے مقام پر رکھ کر دبا دی۔ یہ کام اس نے صرف چند سیکنڈ میں انجام دے دیا تھا مگر ان چند سیکنڈ نے بھی اس کا پسینہ نکال کر رکھ دیا تھا۔

اس نے رومال سے پیشانی پر موجود پسینہ صاف کیا اور پھر ممی کے متعلق تفصیلات پڑھنے میں مصروف ہو گیا جو عین تابوت کے اوپر دیوار میں موجود ایک سنگی بورڈ پر درج تھیں۔

''نام: انطونیہ۔ پیدائش: 1500 ق م

وفات: 1480 ق م۔ پیشہ: فرعون رعمسیس

دوئم کی درباری ساحرہ۔''

تفصیلات پڑھ کر بابر نے دل ہی دل میں انطونیہ پر لعنت بھیجی اور اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہال سے باہر آ گیا۔

ٹیکسی پکڑ کر وہ دوبارہ ہاسٹل پہنچا اور اپنے کمرے میں جا کر آرام کی نیند سو گیا۔ ایک ایسی بھرپور نیند جو ہر فکر اور پریشانی سے آزاد ہوتی ہے۔ وہ نیند جو کڑی مشقت کے بعد میسر آتی ہے۔ خواب میں وہ بزرگ دوبارہ اس سے ملے اور اسے کامیابی کی مبارکباد دینے کے بعد فرمانے لگے۔

''بیٹے! ہمیشہ صراط مستقیم پر چلنا۔ حق اور سچ کا راستہ اگرچہ دشوار لگتا ہے مگر کامیابی اور فلاح کی یہی راہ ہے۔ نیکی کٹھن ضرور ہوتی ہے مگر اللہ تعالیٰ کے ہاں نیکی کا مقام بہت بلند ہے۔ باطل لاکھ طاقتور سہی مگر آخر جیت ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔'' اتنا فرما کر بزرگ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے مگر اس کی آنکھ نہیں کھلی۔ رات بھر کا جاگا ہوا بھلا اتنی جلدی کیسے جاگ سکتا تھا۔

اسی روز شام کے اخبارات میں انطونیہ کی پراسرار موت کی خبر جلی حروف میں شائع ہوئی تھی۔ اخبارات کی سرخی تھی۔ ''مشہور رقاصہ انطونیہ اپنی خوابگاہ میں مردہ حالت میں پائی گئی''۔

انطونیہ کی موت کی خبر پڑھ کر جہاں بابر کو بے حد مسرت ہوئی، وہاں مصری خفیہ ایجنسی نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔



مارِ آستین

موسم سرما کی وہ ٹھٹھرتی ہوئی رات کسی گناہ گار کے دل کی طرح سیاہ تھی۔ سردی کی شدت سے رگوں میں دوڑنے والا لہو جمنے سا لگا تھا۔ اوپر جنگل کا ڈراؤنا اور وحشت ناک ماحول رونگٹے کھڑے کیے جا رہا تھا۔

خوف کی شدت اور ہڈیوں میں سرایت کر جانے والی سردی نے طارق پر لرزہ طاری کر رکھا تھا۔ اگرچہ وہ اکیلا نہیں تھا۔ امجد اور آصف بھی اس کے ساتھ تھے لیکن ان دونوں کی حالت تو طارق سے بھی ابتر تھی۔ وہ تینوں راستہ بھٹک چکے تھے اور اب اس سنسان اور ہیبت ناک جنگل میں زندگی جیسی انمول شے بچانے کی تگ و دو میں ناک ٹوئیاں مارتے پھر رہے تھے۔ برگ آوارہ کی مانند نشان منزل کھو چکے تھے۔

فطرتاً انتہائی نڈر ہونے کے باوجود طارق کا دل ہول رہا تھا۔ بچپن میں سنے گئے غیر مرئی مخلوق کے قصے اسے شدت کے ساتھ یاد آ رہے تھے۔ جنگل میں موجود درختوں اور جھاڑیوں پر بھی انہیں چڑیلوں اور بھوتوں کا گمان ہو رہا تھا۔ ان کے قدموں کے نیچے آ کر چرمرانے والے خشک پتے جنگل کے خوفناک ماحول میں کچھ اس قسم کی آوازیں پیدا کر رہے تھے جیسے سینکڑوں بھٹکی بدروحیں ان کے چاروں طرف منڈلاتے ہوئے بین کر رہی ہوں۔

گھپ اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ٹارچ موجود ہونے کے باوجود اسے جلانے کا رسک نہیں لینا چاہتے تھے کیونکہ دشمن ہمیشہ اندھیرے اور بے خبری کا فائدہ اٹھا کر حملہ آور ہوتا ہے چاہے اس کا تعلق انسانوں سے ہو یا درندوں سے۔ ٹارچ جلا کر وہ اپنے آپ کو آشکارا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ دشمن کو اپنی موجودگی سے بے خبر رکھنا چاہتے تھے۔ ویسے بھی ان تینوں کا تعلق آزاد قبائلی علاقے سے تھا جہاں دشمنوں کو روز مرہ کے مشاغل میں شمار کیا

جاتا تھا مگر اس وقت انہیں دشمن قبیلے کی بجائے جنگلی جانوروں اور درندوں کا خوف دہلائے جا رہا تھا۔

مغربی سرحد کے ساتھ یہ گنجان جنگل میلوں کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ تینوں سفید ریچھ کی تلاش میں اس جنگل تک پہنچے تھے۔ شدید سردیوں کے موسم میں جب سائبیریا کے علاقے میں برف گرنا شروع ہو جاتی تھی تو سفید ریچھ وہ علاقہ چھوڑ کر اس جنگل میں پناہ گزین ہو جاتے تھے۔ سارا دن وہ تینوں سفید ریچھ کی تلاش میں جنگل کا چپہ چپہ چھانتے رہے لیکن انہیں سفید ریچھ کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ دن ڈھلنے سے قبل وہ جنگل سے نکل سکتے تھے مگر امجد کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے وہ یہ موقع گنوا چکے تھے اور اب نصف شب گزرنے کے باوجود واپسی کا راستہ نہیں ڈھونڈ سکے تھے۔

دن کے وقت انہوں نے ایک بکرا نما جانور شکار کر لیا تھا جسے وہاں کی علاقائی زبان میں مارخور کہا جاتا ہے۔ مارخور بکرے سے کافی مشابہت رکھتا ہے لیکن اس کے سینگ بکرے کے سینگوں سے لمبے اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ جنگلی جانور ہونے کی وجہ سے مارخور کا گوشت بہت لذیذ ہوتا ہے۔ ایک علاقائی کہاوت کے مطابق جس گھر میں مارخور کے سینگ موجود ہوں وہاں سانپ بھول کر بھی داخل نہیں ہوتا۔ اب خدا جانے اس کہاوت میں کہاں تک سچائی ہے بہرکیف قبائلی علاقوں میں یہ کہاوت بہت مشہور ہے۔

اچانک امجد کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گرا اور اس کے منہ سے ایک دبی دبی چیخ نکل گئی۔

''ٹارچ کس لیے بجھا رکھی ہے یار؟'' کیا ساری رات ہم اس جنگل میں ٹھوکریں کھاتے پھریں گے''؟ امجد کے اٹھنے سے قبل ہی آصف جھنجھلا کر طارق سے مخاطب ہوا۔ طارق نے بغیر کسی تردد کے ٹارچ چلائی اور دل دھک سے رہ گیا۔ امجد جس چیز سے ٹکرا کر گرا تھا وہ ایک مردہ بھیڑیا تھا۔

''ارے ..... یہ تو مردہ بھیڑیا ہے مگر... مگر یہ مرا کس طرح ہے''؟ امجد بوکھلا کر بولا۔

''دو...... دونوں...... دو ہٹ جاؤ اس سے یہ یقیناً کوئی بدروح ہوگی۔'' طارق نے سہمے ہوئے انداز میں ان دونوں سے کہا۔

''دماغ چل گیا ہے تیرا۔ اکیسویں صدی میں بدروحوں کے قصے الاپ رہے ہو؟

دقیانوسی شخص۔'' آصف نے کرخت لہجے میں جواب دیا۔

''بالکل آصف ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بھیڑیے کی ہی لاش ہے۔ ذرا ٹارچ مجھے تھمانا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ کسی شکاری کی گولی کا نشانہ بنا ہے یا پھر طبعی موت مرا ہے۔'' امجد نے طارق کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ طارق نے بغیر کسی تردد کے ٹارچ اسے تھما دی۔ تھوڑی دیر بعد مردہ بھیڑیے کا جائزہ لینے کے بعد امجد بولا۔ ''لگتا ہے یہ طبعی موت مرا ہے اس کے جسم پر زخم کا نشان تک نہیں ہے اس لیے اس کی کھال محفوظ رہ گئی ہے۔ تم لوگ اگر میرا ساتھ دو تو میں اس کی کارآمد کھال اتار سکتا ہوں۔''

''سوری مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔'' طارق نے فوراً انکار کر دیا۔

''اور تم تمہارا کیا خیال ہے؟'' امجد نے طارق کے جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے آصف سے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

آصف نے ایک نظر ارد گرد کے خوفناک پراسرار ماحول پر ڈالی اور پھر مردہ سی آواز میں بولا۔'' بھیڑیے کی کھال کا کیا کرو گے یار؟ اس خوفناک اور پراسرار جنگل سے نکلنے کی سوچو۔ ہم کسی حادثے کا شکار بھی ہو سکتے ہیں۔''

اس سے پہلے کہ امجد آصف کی بات کا کوئی جواب دیتا دور کہیں سے بھیڑیے کے رونے کی آواز آئی اور تینوں اپنی اپنی جگہ لرز کر رہ گئے۔ آدھی رات کا عالم پراسرار و خوفناک جنگل اور بھیڑیے کے رونے کی دہشت ناک آواز۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے موت کسی بھیانک روپ میں ان کے چاروں طرف منڈل رہی ہو۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم دونوں میرا ساتھ نہیں دینا چاہتا؟'' امجد نے لمحاتی سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

''میری طرف سے تو پکا انکار سمجھو البتہ آصف اگر تمہارا ساتھ دینا چاہتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

طارق نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

''تم دونوں جاؤ جہنم میں مجھے تمہاری مدد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں اکیلا ہی اس بھیڑیے کی کھال اتار لوں گا۔ اب اپنی منحوس صورتیں لے کر دفع ہو جاؤ۔'' امجد نے غصیلے انداز میں کہا اور بیلٹ میں اڑسا ہوا خنجر نکال لیا۔

طارق اور آصف نے لمحہ بھر کے لیے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر بغیر کچھ بولے ایک طرف کو چل پڑے۔ ذرا دیر بعد وہ رات اندھیرے میں گم چکے تھے۔

دوستوں کی آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہی امجد خنجر سنبھال کر مردہ بھیڑیے پر جھک گیا۔ ابھی وہ بھیڑیے کا پیٹ چاک کرنے کے لیے خنجر آگے بڑھانے ہی والا تھا کہ اچانک ہوا کے ایک تیز جھونکے کے ساتھ دوبارہ بھیڑیے کے رونے کی آواز بلند ہوئی اور اس کا آگے بڑھتا ہوا ہاتھ میکانکی انداز میں رک گیا۔ خوف کی شدت سے اس کا پورا بدن لرزنے لگا اور اس کے کانوں میں طارق کے کہے گا الفاظ گونجنے لگے'' دور ہٹ جاؤ۔ یہ یقیناً کوئی بدروح ہوگی۔''

'' شاید طارق ٹھیک ہی کہتا تھا۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا مگر دوسرے ہی لمحے اس کے خوف پر قبائیلوں کا فطرتی غرور غالب آ چکا تھا۔'' یہ بزدلی ہوگی۔'' اس کے دماغ نے اس کے خیال کی تائید کی۔'' میں اگر بھیڑیے کی کھال لے کر نہ گیا تو یار دوست میرا مذاق اڑائیں گے۔ میں علاقے میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں رہوں گا۔''

یکا یک اس کے قبائلی خون نے جوش مارا اور وہ ایک نئے ولولے کے ساتھ خنجر تھام کر مردہ بھیڑیے پر جھک گیا اس نے کھال اتارنے کا عمل بھیڑیے کے پیٹ سے شروع کیا۔ خنجر سے بھیڑیے کے پیٹ میں معمولی سا شگاف ڈالنے کے بعد وہ بالکل کسی ماہر قصائی کی طرح بھیڑیے کی کھال اتارنے میں مصروف ہو گیا۔

جوں جوں وہ بھیڑیے کی کھال اتارتا جا رہا تھا ہوا کے جھونکے آہستہ آہستہ جھکڑ کی شکل اختیار کرتے جا رہے تھے۔ رونے والے بھیڑیے کی آواز بھی وقفے وقفے سے بدستور آ رہی تھی۔ تیز ہوا کی وجہ سے درخت اور جھاڑیاں شائیں شائیں کر رہی تھیں۔ خشک پتے اور جھاڑ جھنکار اڑ اڑ کر اس کے جسم سے ٹکرا رہے تھے۔ مگر وہ ان سب باتوں سے بے خبر عالم جنوں میں بھیڑیے کی کھال اتارنے میں لگا ہوا تھا۔ اس وقت وہ خود بھی ایک خونخوار درندہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ بھیڑیے کے مردہ جسم سے رسنے والی خون آلودہ رطوبت سے لتھڑے ہوئے تھے۔ بھیڑیے کے جسم اور ٹانگوں سے کھال اتارنے کے بعد وہ اس کی گردن تک پہنچ گیا۔ وہ اگر چاہتا تو گردن کے پاس سے بھیڑیے کی کھال کاٹ سکتا تھا مگر نجانے کیوں اس نے خنجر کو مضبوطی سے پکڑا اور ایک جھٹکے کے ساتھ بھیڑیے کی گردن تن سے جدا کر ڈالی۔

یکا یک رونے والے بھیڑیے کی آواز ایک طویل چیخ میں تبدیل ہو گئی اور جھکڑ نے

ایک خوفناک طوفان کی صورت اختیار کر لی۔ ارد گرد موجود تناور درخت کڑکڑاہٹ کی آواز کے ساتھ طوفان بلا خیز کی نذر ہونے لگے۔ کئی درخت جڑوں سے اکھڑنے لگے اور کئی تنا ٹوٹنے کی وجہ سے زمین بوس ہونے لگے۔ ہوا کے ایک تیز جھکڑ نے امجد کے پاؤں زمین سے اکھیڑ ڈالے اور وہ کسی فٹ بال کی طرح اچھلتا ہوا پندرہ بیس قدم دور ایک گڑھے میں جا پڑا۔ اس کے ہوش و حواس اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ تاہم خنجر کے دستے پر اس کے ہاتھ مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔

مردہ بھیڑیے کی کھال بھی تیز ہوا میں اڑتی ہوئی مختلف درختوں اور جھاڑیوں سے ٹکراتے ٹکراتے بالآخر اس گڑھے میں جا گری جہاں امجد بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اس کے گٹھڑی بنے ہوئے جسم کو بھیڑیے کی کھال نے مکمل طور پر ڈھانپ دیا تھا۔

یہ طوفان رات بھر جاری رہا جھاڑ جھنکار اور گرد و غبار گڑھے کی تہہ میں بڑی روانی کے ساتھ گرتا رہا۔ صبح ہونے سے پہلے امجد بھیڑیے کی کھال سمیت زندہ گڑھے میں دفن ہو چکا تھا۔

اس واقعے کو پورا ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ طارق اور آصف بڑی مشکلوں کا سامنا کرتے ہوئے گاؤں پہنچے تھے۔ اس ایک ہفتے کے دوران ان دونوں نے گاؤں کے دوسرے چند افراد کے ساتھ مل کر امجد کی تلاش میں جنگل کا کونا کونا چھان مارا لیکن امجد نے نہ ملنا تھا اور نہ ملا۔ آخر کار وہ تھک ہار کر بیٹھ گئے ویسے بھی امجد کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ نہ کوئی رونے والا اور نہ کوئی رونے والی اس لیے جلد ہی امجد کا وجود گاؤں کے باسیوں کے لیے قصہ پارینہ بن گیا البتہ کبھی کبھار طارق اور آصف باتوں باتوں میں اس کا ذکر کر بیٹھتے تھے۔

ٹھیک بیس دنوں کے بعد اماوس کی رات تھی۔ منظر اسی ویران اور خوفناک جنگل کا تھا۔ آسمان گہرے سیاہ بادلوں سے گھرا ہوا تھا اور بجلی بڑی گھن گرج کے ساتھ وقفے وقفے سے چمک رہی تھی۔ اچانک بادل ایک کان پھاڑ دھماکے کی آواز کے ساتھ گرجا۔ ایک لمحے کے لیے خوفناک جنگل کا ماحول روشن ہوا اور دوسرے لمحے ٹپ ٹپ کی آواز کے ساتھ زوردار بارش شروع ہو گئی۔ بارش کے ساتھ ساتھ چنگھاڑتی ہوئی ہوا نے جنگل کو اعصاب شکن حد تک خوفناک بنا دیا تھا۔ بارش میں جھومتے اور لہراتے ہوئے درخت عجیب و غریب قسم کی آوازیں پیدا کر رہے تھے۔

بیس روز قبل امجد جس گڑھے میں بھیڑیے کی کھال سمیت دفن ہوگیا تھا یکا یک اسی جگہ سے زمین میں ایک دراڑ پڑی جو آہستہ آہستہ چوڑی ہوتی گئی۔ سب سے پہلے اس دراڑ میں پنجے باہر ابھرے ہوئے جو بظاہر انسانی پنجوں کی مانند تھے لیکن ان پنجوں کے نکیلے ناخن اور ان پر موجودہ گھنے سیاہ بال بے حد خوفناک نظر آ رہے تھے۔

پنجوں کے بعد بازو اور پھر سر اور پھر پورا وجود زمین سے باہر نکل آیا۔ عین اسی لمحے بجلی چمکی بادل گرجا اور بارش کی شدت میں اضافہ ہوگیا۔ زمین سے برآمد ہونے والا وجود جوں جوں بارش میں دھلتا گیا توں توں خوفناک شکل اختیار کرتا گیا۔ دور سے اس کی وضع قطع ایک جسم اور قوی الجثہ شخص کی سی نظر آ رہی تھی لیکن اسے نزدیک سے دیکھ کر بہادر سے بہادر شخص بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکتا۔ اس کے پورے جسم پر سر سے لے کر پاؤں تک گھنے بال اگے ہوئے تھے جو بالکل بھیڑیے کے بالوں کی طرح ڈارک براؤن کلر کے تھے۔ چہرہ ایک بڑے بن مانس سے مشابہ تھا البتہ دانت بن مانس کے دانتوں سے لمبے اور نوکیلے تھے۔

کنگ کانگ سے ملتی جلتی یہ بلا اپنی جگہ پر موجود تھی کہ اچانک سامنے والی جھاڑیوں سے ایک بھیڑیا بوکھلائے ہوئے انداز میں باہر نکلا اور اسی طرح دوڑ پڑا شاید اس کی نظر کنگ کانگ نما بلا پر نہیں پڑی تھی۔ بھیڑیا ابھی اس سے چند قدم دور ہی تھا جب خوفناک بلا نے ایک کریہہ کی چیخ کے ساتھ بھیڑیے پر چھلانگ لگا دی۔

بھیڑیے نے تڑپ کر اس کی گرفت سے نکلنا چاہا تھا۔ خدا کی پناہ وہ تو کوئی عفریت تھا۔ اس نے بھیڑیے کو پوری طرح چیخنے تک کی مہلت نہ دی۔ اس کے خوفناک پنجوں میں آ کر بھیڑیے کی گردن چشم زدن میں تڑاخ کی آواز کے ساتھ ٹوٹ گئی۔ بھیڑیا ابھی زمین پر تڑپ رہا تھا جب اس بلا نے اپنے نوکیلے پنجے بھیڑیے کے پیٹ میں گاڑ دیئے۔ بھل بھل کرتا ہوا گرم گرم خون بھیڑیے کے پیٹ سے نکل کر بارش کے پانی میں ملنے لگا اور شفاف پانی سرخی مائل ہوتا گیا۔

دوسرے لمحے بھیڑیا کے پیٹ سے آنتیں۔ کلیجہ اور دوسرے اعضاء نکال کر نکال کر خوفناک بلا ہڑپ کرنے لگی۔ اس خونی منظر کو دیکھنے والے صرف قدرت کے خاموش نظارے تھے یا صرف وہ خوفناک بلا کہ جو اس خونی ضیافت کے مزے لوٹ رہی تھی۔ اگر کوئی باہوش انسان اس جگر پاش منظر کو دیکھ لیتا تو یقیناً اس کے دل کی دھڑکن رک جاتی۔

بھیڑیے کے اندرونی اعضاء چٹ کرنے کے بعد وہ ہیبت ناک بلا بھیڑیے کا باقی ماندہ جسم اٹھا کر اٹھی اور جھاڑیوں میں اچھال دیا جہاں سے بدقسمت بھیڑیا باہر نکلا تھا۔

بارش بدستور جاری تھی لیکن اب اس کی شدت میں کمی آ چکی تھی۔ خونی بلا نے ایک لمحے کے لیے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا اور پھر ایک سمت کا تعین کر کے اس جانب دوڑ لگا دی۔ اس کی رفتار کسی چیتے کی مانند تیز تھی۔ جھاڑیوں اور چھوٹے موٹے گڑھوں کو پھلانگتے ہوئے خونی بلا بہت جلد گاؤں کے قریب پہنچ گئی۔

پورے گاؤں میں ہو کا عالم تھا۔ چند لمحے قبل ہونے والی بارش نے موسم کو بے حد سرد کر دیا تھا اس لیے لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی ہوا کا کوئی تیز جھونکا چلتا تو اس جان لیوا سکوت میں لمحہ بھر کے لیے ارتعاش پیدا کر دیتا تھا۔ ورنہ تو کتے تک کونوں کھدروں میں چھپے ہوئے تھے۔ خونی بلا دبے پاؤں پورے گاؤں میں چکراتی رہی لیکن اسے گاؤں کی کسی بھی گلی میں کوئی ذی روح نہ مل سکا۔ اس کے انداز سے بے چینی جھلک رہی تھی شاید بھیڑیے کی ضیافت اڑانے کے بعد اس کی بھوک اور خونخواری میں شدت آ چکی تھی۔ پھرتے پھراتے وہ ایک کوچے میں پہنچ کر ایک دروازے کے سامنے رک گئی۔ ابھی اس نے دروازے پر دستک دینے کے لیے اپنا خوفناک پنجہ اٹھایا ہی تھا کہ اچانک کہیں سے ایک جسیم کتا نکلا اور چھلانگ لگا کر اس پر جھپٹ پڑا۔ اس غیر متوقع افتاد نے ایک لمحے کے لیے تو اس بلا کو ہراساں کر دیا مگر دوسرے ہی لمحے بدقسمت کتا اس کے خوفناک اور نوکیلے پنجوں کے شکنجے میں پوری طرح پھنس چکا تھا۔ خونی بلا نے پنجہ مار کر کتے کی دونوں آنکھیں پھوڑ ڈالی تھی۔ درد کی شدت سے کتا بیچارا ''چیاؤں چیاؤں'' کر رہا تھا مگر شاید اس کے دن پورے ہو چکے تھے۔ خونی بلا نے دیکھتے ہی دیکھتے کتے کے نرخرے پر اپنے نوکیلے دانت گاڑے اور کتا خرخراہٹ کی آواز کے ساتھ ہی ماہی بے آب کی طرح تڑپتے تڑپتے ساکت ہوگیا۔ تب اس بلا نے پنجوں اور دانتوں کی مدد سے مردہ کتے کے جسم کے بے شمار چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر ڈالے۔ اس کے خونخوار پنجوں اور نوکیلے دانتوں پر کتے کا خون اور گوشت کے چھیچھڑے بہت ہی خوفناک لگ رہے تھے۔ پراسرار خوفناک اور سرد رات کا یہ منظر رونگٹے کھڑے کرنے کے لیے بے کافی تھا۔

یکا یک وہی دروازہ جس پر دستک دینے کے لیے اس بلا نے پنجہ اٹھایا تھا ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور ایک بارعب مردانہ آواز ابھری۔ ''رات کے اس وقت یہ کیا ہو رہا

ہے؟'' دروازہ کھولنے والا شاید حد سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار تھا اس نے بغیر کسی تردد کے دروازہ کھول دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ بھی موجود تھی لیکن جونہی اس نے اپنے سامنے روشنی ڈالی اس کے منہ سے ایک دہشت ناک چیخ نکلی اور رات کا سناٹا لمحہ بھر کے لیے تھم گیا۔ ٹارچ اس کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر گر چکی تھی اور وہ خود کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ شاید زندگی میں ایسا خوفناک منظر وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ خوفناک بلا اپنی جگہ سے اچھلی اور اس شخص کو اپنے مضبوط بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔ اس بیچارے نے اس عفریت کے شکنجے سے نکلنے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن یہ اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ خوفناک بلا نے ایک ہاتھ سے اس شخص کی گردن دبوچی اور دوسرے ہاتھ کی خوفناک اور نوکیلی انگلیاں بڑی بے رحمی کے ساتھ اس کے سینے میں گھسیڑ دیں۔ اس بدنصیب کے منہ سے صرف ایک گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی اور اس کے ساتھ اس کے سینے سے گرم گرم خون کسی چشمے کی طرح ابلنے لگا۔ اس کا جسم خوفناک بلا کے ہاتھوں میں تڑپ رہا تھا۔ بل کھا رہا تھا۔ اس کے سینے سے ابلنے والا خون گیلی زمین پر بہہ رہا تھا لیکن کوئی اسے بچانے والا نہیں تھا۔ زندگی جب موت کے شکنجے میں پھنستی ہے تو پھر انسان چاہے لاکھ تدبیر کرے کوئی بھی کارگر نہیں ہوتی۔ زندگی کا الٹ موت ہے لیکن یہ کسی کو خبر نہیں ہے کہ اس کی موت کون سا روپ دھار کر اس کے سامنے آئے گی۔

دروازہ کھولنے والے اس بدنصیب شخص کو اگر قبل از وقت یہ معلوم ہوتا کہ باہر اس کی موت بھیانک روپ میں موجود ہے تو شاید وہ بھول کر بھی دروازہ کھولنے کی غلطی نہ کرتا۔

چند منٹ تڑپنے کے بعد وہ بدقسمت شخص ساکت ہو چکا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس بلا نے مردہ شخص کا سینہ اور پیٹ نوکیلے پنجوں کی مدد سے چاک کر دیا۔ خون آلودہ آنتیں پیٹ سے باہر کھینچنے کے بعد اس نے کلیجہ، دل، گردے اور دوسرے نازک اعضاء نکال نکال کر ہڑپ کرنا شروع کر دیے۔ ڈراؤنی سیاہ رات میں اس کے منہ سے نکلنے والی ''چپڑ چپڑ'' کی آواز ماحول کی خوفناکی میں حد درجہ اضافہ کر رہی تھی۔

یہ خونی ضیافت اڑانے کے بعد وہ خوفناک بلا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوگئی۔ اس کے نوکیلے پنجوں اور باچھوں سے انسانی خون ٹپک رہا تھا مگر اسے اس کی کوئی پرواہ نہیں تھا۔ اس نے مکان سے باہر نکلنے کے بعد دوبارہ جنگل کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس کے قدموں کی دھمک سے

زمین لرز رہی تھی۔ جنگل کی طرف سے بھیڑیے کے رونے کی دہشت ناک آواز آ رہی تھی جسے سن کر اس کی رفتار لمحہ بہ لمحہ بڑھتی گئی اسے کوئی نادیدہ طاقت اسی گڑھے کی طرف کھینچ رہی تھی جہاں سے وہ نکلی تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن اس چھوٹے سے قبائلی گاؤں میں خوف و ہراس کی ایک ایسی لہر پھیل چکی تھی جس نے ہر مرد و زن اور چھوٹے بڑے کی رنگت اڑا کر رکھ دی تھی۔ ہر شخص کے چہرے پر ایک نادیدہ خوف چھایا ہوا تھا۔ ہر ایک آنے والے وقت سے خوفزدہ تھا۔ ایسا دہشت ناک اور پراسرار واقعہ اس گاؤں میں پہلی بار پیش آیا تھا۔ وہ معصوم ان پڑھ اور سادہ سے لوگ تھے۔ اگرچہ ان کے ہاں قبیلوں کے درمیان خون ریز دشمنیاں چلتی رہتی تھی لیکن اس قسم کی بھیانک اور روح کو لرزا دینے والی ہلاکت کبھی بھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

خونی بلا کا شکار ہونے والا نوجوان اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ پورے گاؤں میں اس کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا نوجوان تھا۔ خوامخواہ کے لڑائی جھگڑے اور دشمنیاں اسے اچھی نہیں لگتی تھیں۔

صبح ہی صبح گاؤں کے لوگ ان کے گھر میں جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ کٹی پھٹی لاش کو دیکھ کر نرم دل عورتیں بے ہو چکی تھیں۔ جنہیں اٹھا کر لاش سے دور لے جایا گیا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت بریدہ لاش سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ وہ شاید اس بدقسمت نوجوان کی ماں تھی۔ گاؤں کی عورتیں اور بڑے بوڑھے اسے تسلیوں پر تسلیاں دیے جا رہے تھے لیکن وہ بدستور رو رو کر بین کیے جا رہی تھیں۔ یہ ڈھارس تسلی اور دلاسا تو کھوکھلی باتیں ہوتی ہیں۔ ان سے دکھوں کا مداوا ہو سکتا تو شاید دنیا کی کوئی ماں اپنی جوان اولاد کے مرنے پر ایک آنسو تک نہ بہاتی۔

عین دوپہر کے وقت آہوں اور سسکیوں کے درمیان اسے سپرد خاک کر دیا گیا۔ فاتحہ خوانی کے بعد گاؤں کے سرکردہ لوگوں کا جرگہ اس معاملے پر غور و خوض کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔ آصف اور طارق بھی جرگے میں موجود تھے۔

سردار باری باری ہر شخص پر معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے سوال پر سوال کر رہا تھا۔ ہر شخص اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہا تھا۔ زیادہ تر لوگوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ یہ کسی جنگلی جانور کی

کارروائی ہے۔ چند ایک لوگ اس معاملے کو کسی نامعلوم قاتل کی طرف منسوب کر رہے تھے لیکن ان کا موقف بہت کمزور تھا ان کے پاس ایسی کوئی ٹھوس دلیل موجود نہیں تھی جس کے ذریعے وہ یہ ثابت کر سکتے کہ یہ واقعی کسی قاتل کی کارستانی ہے۔ غرض جتنے منہ تھے اتنی باتیں جرگے میں ہو رہی تھیں۔

تمام معززین جرگہ کی باتیں سننے کے بعد سردار نے وہاں موجود حاضرین پر ایک نظر ڈالی اور پھر کسی نتیجے پر پہنچ کر بولا" معززین جرگہ! یہ واقعی کسی جنگلی جانور کی کارستانی لگتی ہے لیکن یہ کوئی چھوٹا موٹا جانور نہیں ہے۔ یہ شیر یا پھر چیتا ہو سکتا ہے۔ آپ سب حاضرین یہ بات اچھی جانتے ہیں کہ جس درندے کے منہ کو انسانی خون لگ جاتا ہے وہ بار بار آبادی کا رخ کرتا ہے۔ میں آپ لوگوں سے استدعا کرتا ہوں کہ اس خطرناک معاملے پر قابو پانے کے لیے اپنی اپنی رائے کا کھل کر اظہار کریں۔ سردار ہونے کے ناطے میرا یہ فرض بنتا ہے کہ میں جو بھی فیصلہ کروں آپ سب کی مرضی کے مطابق کروں"۔ یہ کہہ کر سردار جواب طلب نظروں سے حاضرین جرگہ کی طرف دیکھنے لگا۔

ایک ادھیڑ عمر شخص نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا" سردار اگر یہ واقعی کوئی آدم خور جانور ہے تو پھر کیوں نہ اسے گاؤں میں ہی گھیر کر شکار کیا جائے"۔

"میں بھی کچھ اس طرح سوچ رہا ہوں لیکن پہلے آپ لوگوں کی رائے لینا ضروری ہے۔" سردار نے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

اچانک آصف کے ساتھ بیٹھا ہوا طارق کھڑے ہو کر بولا" سردار! کیا ضروری ہے کہ یہ کسی جنگلی جانور کی ہی کارروائی ہو۔ مجھے تو یہ معاملہ کچھ پراسرار قسم کا نظر آ رہا ہے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" سردار نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

تمام حاضرین جرگہ کی نگاہیں اب طارق پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ تھوڑا سا نروس ہو گیا تھا تاہم سنبھل کر بولا" سردار میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ کسی جن بھوت، چڑیل یا کسی بھٹکی ہوئی بدکار روح کا کام بھی ہو سکتا ہے۔ سنا ہے کہ بدروحیں روپ بدلنے پر قادر ہوتی ہیں۔"

"سردار! اگر ہم قبائلی بھی اس انداز میں سوچنے لگے تو پھر ہو گیا اپنا گزارہ۔ ایسی فرسودہ باتیں ہمیں زیب نہیں دیتیں۔ مانا کہ جنات کا وجود برحق ہے مگر وہ اس قسم کی بہیمانہ وارداتیں نہیں کرتے۔ اس نوجوان کی بات میں کوئی وزن نہیں ہے۔ ہمیں دوسرے پہلو پر سوچنا

چاہیے کہ یہ کسی آدم خور درندے کا کام ہے۔" ایک اور ادھیڑ عمر شخص نے اپنی جگہ سے اٹھ کر جواب دیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کسی سانپ کی آنکھوں سے مشابہ تھیں۔ تنگ پیشانی پر لکیروں کا جال پھیلا ہوا تھا اور ناک طوطے کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی تھی۔ اس کے موٹے موٹے سیاہ بھدے ہونٹوں پر مکارانہ مسکراہٹ چھائی ہوئی تھی اور وہ طارق کو بڑی کینہ توز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

سردار نے اس کی بات سن کر کہا" شمروز خان! میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ تم اس گاؤں کے ذہین ترین شخص ہو۔ میرے مرحوم بابا جان کہا کرتے تھے کہ اگرچہ شمروز خان پیدائشی ہمارے گاؤں کا نہیں ہے کسی اور جگہ کا رہنے والا ہے اور ہمارے پاس پناہ گزین بن کر آیا تھا لیکن بہت ذہین اور بہادر آدمی ہے اس نے ہمیشہ مجھے صحیح مشورہ دیا ہے"۔

"سردار! میں آپ کے مرحوم بابا خان کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا لیکن مرحوم سردار کی مردم شناسی سے انکار بھی نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمت کرے۔ جوہر شناس شخص تھے۔ انہوں نے آڑے وقت میں مجھ غریب پر قابل قدر احسانات کیے تھے۔ مرحوم ہر معاملے میں میری رائے کو فوقیت دیا کرتے تھے۔" شمروز خان نے خوشامدانہ لہجے میں جواب دیا۔

"شمروز خان۔" سردار نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا" بابا جان کی طرح میں بھی آج تمہارے مشورے کا محتاج ہوں۔ اس سنگین صورتحال سے نمٹنے کے لیے مجھے تمہاری رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے کہ فیروز خان کی طرح کوئی اور بدقسمت نوجوان اس آدم خور کا نشانہ بن جائے ہمیں اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کوئی منصوبہ سوچ لینا چاہیے۔ شمروز خان نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گھما کر حاضرین جرگہ کو دیکھا اور ذرا توقف سے بولا۔" سردار! میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے اگر اجازت ہو تو عرض کروں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میرا یہ منصوبہ سو فیصد کامیاب ہوگا۔"

حاضرین جرگہ اب پوری طرح شمروز خان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ سوائے طارق اور آصف کے۔ وہ دونوں اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔ سردار کی اجازت ملتے ہی شمروز خان اونچی آواز میں بولا۔" سردار! آپ ایسا کریں کہ طارق اور آصف جیسے تقریباً آٹھ نو جوان اور تیار کریں۔ یہ دس جوانوں کی ایک پارٹی بن جائے گی۔ اس پارٹی کے

دو گروپ بنیں گے جو کہ پانچ پانچ جوانوں پر مشتمل ہوں گے۔ گروپ لیڈر طارق اور آصف ہوں گے۔ ایک گروپ آج رات مسلح ہو کر پہرہ دے گا اور دوسرا گروپ کل رات۔ اسی طرح یہ سلسلہ بلا ناغہ چلتا رہے گا۔ یہاں تک کہ اس موذی جانور کا خاتمہ ہو جاتا''۔ شمروز خان بات ختم کر کے فخریہ انداز میں اہل جرگہ کی طرف دیکھنے لگا کیوں کہ اسے سردار کی طرف مکمل داد کی توقع تھی۔

سردار نے شمروز خان کی توقع کے برعکس حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ''اگر آپ معززین کو شمروخان کی بات سے اتفاق ہے تو پھر ایسا کر دیکھتے ہیں اس طرح ہم اگر اس آدم خور درندے کا خاتمہ نہ کر سکے تو بھی ممکنہ خطرے سے محفوظ رہیں گے۔''

تقریباً تمام حاضرین جرگہ نے سردار کے اس فیصلے کی تائید کھلے دل اور خوشی کے ساتھ کی۔ سوائے طارق اور آصف کے وہ دونوں صرف ظاہری طور پر خوش نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے ورنہ دل ہی دل میں وہ شمروز خان پر ہزاروں مرتبہ لعنت بھیج چکے تھے۔ وہ دونوں سرگوشیوں میں شمروز خان پر تنقید کر رہے تھے۔

جرگے کی کارروائی ختم ہونے کے بعد طارق اور آصف ایک ساتھ ہی وہاں سے نکلے تھے۔ چلتے چلتے طارق بولا'' یہ شمروز خان تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا پرلے درجے کا سور ہے۔ اس کا رنگ ڈھنگ دیکھا ہے مجھے تو یہ قبائلی ہی نہیں لگتا۔ نہ اس کے آگے پیچھے کا پتہ ہے اور نہ ہی ذات پات کا۔''

''مگر سردار تو ہر بات میں اس کی رائے کو فوقیت دیتا ہے۔'' آصف بولا۔

''سردار کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ اسے نہ گاؤں کی عزت کا خیال ہے اور نہ ہی اپنی سرداری کا پاس ایک غیر قبائلی شخص کی رائے کو ہر بات میں اہمیت دیتا۔ ہم قبائلیوں کی توہین ہے۔'' طارق نے جلے بھنے لہجے میں جواب دیا۔

''یار طارق ایک بات کہوں!'' آصف نے آگے پیچھے دیکھتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

''کہو''۔

''تم نے شمروز خان کو آج صبح فیروز کے گھر میں دیکھا تھا؟ سارا گاؤں افسردہ تھا۔ ہر شخص شدت غم سے آنسو بہا رہا تھا۔ کچھ لوگ شدت خوف سے سہمے ہوئے تھے مگر شمروز خان

اس طرح مطمئن نظر آ رہا تھا جیسے کسی شادی کی تقریب پر آیا ہوا ہے۔ اسکے چہرے پر خوف کا ہلکا سا شائبہ تک نہیں تھا اور نہ ہی اسے کوئی افسوس تھا۔''

آصف کی اس بات نے طارق کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے ذرا توقف سے کہا۔ ''میرے دوست! میں اس کے متعلق بہت پہلے سے مشکوک ہوں۔ تمہیں یاد ہے جب پانچ برس پہلے امجد کے والدین جس پہاڑی کھائی پر مردہ پائے گئے تھے۔ اس کے آس پاس گاؤں کے کافی لوگوں نے شمروز خان کو چکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ کیا ان دونوں کی موت میں شمروز خان کا ہاتھ نہیں ہو سکتا؟ مجھے تو یہ شخص کافی پراسرار لگتا ہے۔ میں کافی دنوں سے اس پر نظر رکھنے کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ ہمیں اس کی تاڑ میں رہنا چاہیے''۔

''اور امجد کی پراسرار گمشدگی کو بھول گئے ہو؟''

آصف نے اسے یاد دلانے والے انداز میں کہا۔

''بالکل نہیں بھولا۔ ہم دونوں آج سے شمروز خان پر کڑی نظر رکھیں گے۔ وہ دن بھر کیا کرتا رہتا ہے کس کس شخص سے ملتا رہتا ہے۔ رات کے وقت اس کی کیا کیا مصروفیات ہوتی ہیں یہ جاننا بہت ضروری ہے۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں دوست۔'' آصف نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے پھر شام کے بعد ملیں گے۔'' طارق اس سے اجازت طلب کرتے ہوئے بولا۔

شام کے بعد وہ دونوں شمروز خان کے مکان سے کچھ فاصلے پر موجود گھنی جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ شمروز خان کا مکان ویسے بھی گاؤں کے دوسرے گھروں سے ذرا فاصلے پر واقع تھا۔ اس کے مکان کے اردگرد جنگلی جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ وہاں چھپنا ایسا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس لیے وہ دونوں بڑی بے فکری کے ساتھ شمروز خان کے مکان پر نگاہیں رکھے ہوئے تھے۔ شام کا اندھیرا آہستہ آہستہ تاریکی میں ڈھلتا جا رہا تھا۔ طارق کو پختہ یقین تھا کہ شمروز خان ضرور گھر سے باہر نکلے گا۔ اس نے ایک نظر اپنی کلائی پر بندھی ریڈیم ڈائل گھڑی پر ڈالی اور ٹائم دیکھ کر مطمئن انداز میں آصف سے بولا۔ ''ہمارے پاس کافی وقت ہے رات کا پہرہ بارہ بجے شروع ہوگا اور ابھی صرف سات بجے ہیں۔''

''ذرا خیال رکھنا آج پہرے کی باری بھی تمہارے گروپ کی ہے۔'' آصف نے تاکیدی انداز میں کہا۔

''بے فکر رہو مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس ہے۔''

اسی دوران شمروز خان کے مکان کا بیرونی دروازہ کھلا اور وہ دونوں چوکنا ہو گئے۔ باہر آنے والے شخص کو وہ بڑی آسانی سے پہچان گئے وہ بلاشبہ شمروز خان تھا۔ اس نے باہر سے مکان کو تالا لگایا اور مطمئن انداز میں ایک طرف کو چل پڑا۔ بیوی بچوں کے جھنجھٹ سے آزاد ہونے کے وجہ سے وہ ہمیشہ اپنے مکان کو تالا لگا کر رکھتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا بھی موجود تھا۔

طارق اور آصف دبے قدموں جھاڑیوں سے باہر نکلے اور شمروز خان کے تعاقب میں چل پڑے۔ انہوں نے اس امر کا خاص خیال رکھا تھا کہ شمروز خان تعاقب سے بے خبر رہے۔ شمروز خان کا رخ گاؤں سے باہر کی طرف تھا۔ یہاں تک کہ وہ جنگل کے ماحول کا جائزہ لینے کے بعد بلاخوف جنگل میں گھس گیا۔

طارق اور آصف بھی بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے جنگل میں داخل ہو گئے۔ ان دونوں کے دل کسی نادیدہ خوف کی وجہ سے دھڑک رہے تھے لیکن تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ شمروز خان کا پیچھا کر رہے تھے۔

چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں سے الجھتے اور بچتے بچاتے شمروز خان ایک کھلی جگہ پہنچ کر ٹھہر گیا۔ وہ دونوں بھی اسے رکتے دیکھ کر ایک جھاڑی کی آڑ لے کر رک گئے۔ تاہم ان دونوں کی نظر بدستور شمروز خان پر لگی ہوئی تھیں۔ شمروز خان نے تھیلا زمین پر رکھا اور خود بھی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ ایک لمحہ بیٹھے رہنے کے بعد اس نے تھیلا کھولا اور لوہے کا ایک نوکدار ٹکڑا نکال کر اپنے چاروں طرف ایک دائرہ کھینچ دیا۔ طارق اور آصف متحیر انداز میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دائرہ کھینچنے کے بعد شمروز خان نے تھیلے سے کچھ موم بتیاں نکالیں اور انہیں جلانے کے بعد دائرے کی لکیر پر ایک ایک فٹ کے فاصلے پر رکھتا گیا اب اس کے چاروں طرف موم بتیاں جل رہی تھیں۔ طارق اور آصف کے لیے حیران کن بات یہ تھی کہ اچھی خاصی ہوا چلنے کے باوجود شمرز خان کی جلائی ہوئی موم بتیاں بجھ نہیں رہی تھیں۔

اس کے بعد شمروز خان نے تھیلے سے بالشت بھر کی ایک مورتی نکالی اور اسے اپنے سامنے زمین پر کھڑا کر دیا۔

''ارے یہ تو مجھے کوئی پنڈت لگتا ہے۔'' اسے مورتی رکھتے دیکھ کر آصف بے اختیار بول اٹھا۔

''شش''۔ طارق نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اسی دوران شمروز خان تھیلے سے ایک انسانی کھوپڑی نکال کر اپنے سامنے رکھ چکا تھا۔ دیا سلائی جلا کر اس نے جونہی کھوپڑی میں پھینکی یکدم آگ بھڑک اٹھی شاید کھوپڑی میں کوئی جلنے والا سیاہ مادہ موجود تھا۔

یہ سارا کام سرانجام دینے کے بعد وہ مورتی کے سامنے ہاتھ باندھ کر بیٹھ گیا۔ انداز بالکل ایسا تھا جیسے پوجا کر رہا ہو۔ آصف کے لیے اب اپنی زبان پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا تھا تبھی وہ سرگوشیانہ انداز میں بولا۔'' کاش ہم یہ سب کچھ سردار کو دکھا سکتے۔ اسے بھی پتہ چلتا کہ شمروز خان کا اصل روپ کیا ہے؟''۔

''تم خاموش نہیں رہ سکتے۔'' طارق نے اسے دبنگ لہجے میں جھڑکتے ہوئے کہا۔ ''احمق انسان آگے آگے دیکھو کیا ہوتا ہے سردار کو تو بعد میں بتایا جا سکتا ہے۔''

شمروز خان کو مورتی کے سامنے پوجا کرتے ہوئے تقریباً آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا وہ بہت ہی دھیمی آواز میں زبان سے کچھ عجیب و غریب الفاظ دہراتا جا رہا تھا لیکن اس کی آواز طارق اور آصف تک نہیں پہنچ رہی تھی تاہم وہ دونوں بڑے غور سے اس کی حرکات و سکنات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

اچانک شمروز خان سے چند فٹ کے فاصلے پر زمین پھٹی اور پھر زمین سے نکلنے والی خوفناک اور دہشت ناک ہستی دیکھ کر ان دونوں کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ان دونوں کے دل پہلو میں یوں اچھل رہے تھے جیسے سینہ پھاڑ کر باہر نکل پڑیں گے اور بدن شدت خوف سے سوکھے پتے کی مانند لرز رہے تھے۔ سردی کا موسم ہونے کے باوجود ان کے پسینے چھوٹے ہوئے تھے۔ وہ بھاگنا چاہتے تھے مگر بھاگ نہیں سکتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر شمروز خان کی نظروں میں آ گئے تو پھر ان کی موت یقینی ہے خوف نے ان کے پاؤں جکڑ رکھے تھے۔ وہ بولنا چاہتے تھے مگر ان دونوں کی گویائی سلب ہو کر رہ گئی۔ پراسرار دہشت ناک وجود کو باہر نکلتے دیکھ کر شمروز خان پھرتی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔'' پرنام پتا جی! میں آپ کا بیٹا

نارائن چند ہوں۔ آپ کی آتما کو یہ خوفناک روپ میں نے دیا ہے تاکہ ان نسلوں سے آپ اپنا انتقام لے سکیں۔ آپ کو اس گڑھے میں جس اپرادھی نے زندہ دفن کیا تھا اسے تو میں نے اس کی پتنی سمیت نرک میں پہنچا دیا ہے اور اس کے بیٹے امجد کو اس جنگل میں گھیر کر زندہ دفن کیا ہے۔ اس رات اگر وہ امجد مردہ بھیڑیے کی کھال نہ اتارتا تو میرا کوئی عمل آپ کی آتما کو یہ روپ نہیں دے سکتا تھا۔ اصل میں یہ خوفناک روپ امجد کا ہے لیکن یہ آتما آپ کی ہے۔ امجد کی آتما تو اپنے پتا اور ماتا کے پاس نرگ میں پہنچ چکی ہوگی۔'' نارائن چند ایک لمحے کے لیے سانس لینے کے لیے رکا اور پھر دوبارہ بولا۔'' پتا جی میں نے کڑی تپسیا اور جان جوکھم میں ڈال کر ان مسلوں کے بیچ رہ کر آپ کی آتما کو یہ نیا روپ اس لیے دیا ہے کہ آپ باری باری اس گاؤں کے تمام سرکردہ لوگوں کو نرگ میں پہنچا دیں۔ ان میں سے ایک بھی زندہ بچنے نہ پائے مجھے معلوم ہے کہ اس روپ میں آپ کے پاس بولنے کی شکتی نہیں ہے۔ آپ صرف غرا سکتے ہیں۔ چیخ سکتے ہیں لیکن بول نہیں سکتے مگر سننے کی شکتی آپ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ ان لوگوں کے پاس آپ کا یہ نیا روپ ختم کرنے کے لیے کوئی اپائے نہیں ہے۔ آپ کو آگ جلا سکتی ہے نہ پانی ڈبو سکتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کا اسلحہ آپ پر اثر کر سکتا ہے۔ ویسے تو ایک چھوٹی سی گولی آپ کو ختم کر سکتی ہے لیکن وہ کوئی عام گولی نہیں ہوگی اس کے بارے میں صرف میں جانتا ہوں اس لیے آپ کو چنتا کرنے کی نہیں ہے۔ میں 786 نمبر کی گولی کے بارے میں کسی قبیلے کو بھلا کیسے ....؟''

آخری الفاظ نارائن چند کے منہ سے نکلنے بھی نہیں پائے تھے کہ اچانک وہ خوفناک بلا اپنی جگہ سے اچھلی اور دوسرے ہی لمحے نارائن چند اس کے مضبوط بازوؤں میں کسی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا مگر اس عفریت کی گرفت سے نکلنا اتنا آسان نہیں تھا۔

''پپ...... پتا...... جی...... مم...... مجھے شما ...... کر دیجئے ...... میری زبان...... سے غلطی کی وجہ ...... سے انجانے میں ...... آپ کا ...... انت کرنے والی گولی ...... کا نمبر ...... نکل ...... گیا۔'' نارائن چند نے بمشکل اٹکتے اٹکتے یہ الفاظ ادا کیے تھے اس کے بعد اسے بولنے کی مہلت ہی نہیں مل سکی تھی خوفناک بلا نے دونوں پنجے تیز دھار خنجروں کی طرح اس کے سینے میں گھس چکے تھے۔

طارق کسی سحر زدہ شخص کی طرح یہ خونی منظر دیکھ رہا تھا اسے معلوم ہی نہیں ہوا تھا کہ

آصف کب اس کے قدموں کے پاس بے ہوش پڑا ہے۔ یہ رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر آصف کی برداشت سے باہر تھا۔

خونی بلا اب نارائن چند کے پیٹ کو پھاڑ چکی تھی اور بڑے مزے کے ساتھ اس کی آنتیں اور دیگر نازک اعضاء ہڑپ کرنے میں مصروف تھی۔ اس کے منہ سے نکلنے والی ''چپڑ چپڑ'' کی آواز سن کر طارق کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں لیکن وہ اپنی جگہ سے انچ بھر حرکت کرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔

پھر طارق کے دیکھتے ہی دیکھتے اس دہشت ناک بلا نے نارائن چند کے بریدہ بدن کو اٹھا کر ایک طرف جھاڑیوں میں اچھال دیا اور خود زمین کے اسی خلاء میں چھلانگ جہاں سے اس کا وجود برآمد ہوا تھا۔ اب جنگل میں مکمل سناٹا تھا۔ اس قدر خاموشی تھی کہ طارق کو اپنے دل کی دھک دھک بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس کے بدن پر پسینہ چیونٹیوں کی طرح رینگ رہا تھا۔ قریب تھا کہ وہ آصف کی طرف ہوش وخرد سے بیگانہ ہو جاتا۔ مگر اچانک زندگی جیسی انمول نعمت بچانے کے خیال نے اسے خطرے کا احساس دلا دیا۔

''آصف! جلدی سے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔''

وہ مردہ سی آواز میں بولا مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا تب اس نے سر گھما کر دکھا تو اس کا خون شدت خوف سے خشک ہو گیا۔

آصف اس کے قریب ہی بے ہوشی کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔

''یا اللہ! میری مدد فرمانا۔'' اس کے دل کی گہرائیوں سے آواز نکلی اور پھر اس نے جھک کر بے ہوش پڑے ہوئے آصف کو اٹھا لیا اور کندھے پر رکھنے کے بعد تقریباً بھاگنے کے انداز میں جنگل سے باہر کی طرف لپکا۔ جھاڑیوں اور کانٹوں سے الجھتے الجھتے آخرکار وہ جنگل سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ بڑی مشکل سے آصف کو ہوش میں لانے کے بعد وہ دہشت زدہ لہجے میں بولا۔'' بھاگو ورنہ ہمارا حشر بھی نارائن چند کی طرح ہوگا۔'' اتنا کہہ کر اس نے خوف سے سہمے ہوئے آصف کا ہاتھ پکڑا اور گاؤں کی طرف دوڑ لگا دی۔ آصف چپ چاپ اس کے ساتھ بھاگ رہا تھا اسے طارق سے کچھ بھی پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

گاؤں میں داخل ہونے کے بعد دونوں نے سیدھا سردار کے گھر کا رخ کیا۔ سردار کے سامنے جب طارق نے سارا ماجرا بیان کیا تو وہ مذاق اڑانے والے انداز میں بولا۔'' تم

شاید پاگل ہو یا پھر مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔تمہارے پاس اس واقعے کو سچ ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت ہے تو پیش کرو!''۔

''ثبوت ہے۔'' طارق نے غصے سے کہا۔'' نارائن چند عرف شمروز خان کے مکان میں اس وقت تالا پڑا ہوا ہے اور اس کی کٹی پھٹی لاش جنگل کی جھاڑیوں میں موجود ہے یقین نہ آئے تو خود چل کر شمروز خان کا مکان دیکھ لو وہ اگر اپنے گھر میں موجود ہو تو پھر بے شک میرا گلا کاٹ دینا۔''

طارق کے الفاظ سے زیادہ اس کی شکل سردار کو سچائی کا احساس دلا رہی تھی اس لیے وہ بلا تردد ان دونوں کے ساتھ نارائن چند عرف شمروز خان کے گھر کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر جب سردار نے مکان میں پڑا تالا دیکھا تو پہلی بار تشویش زدہ انداز میں بولا۔ یہ شمروز خان کمینہ تو آستین کا سانپ نکلا۔ خدا ہمیں معاف کرے اتنا عرصہ ہم ایک پنڈت کے ہاتھوں کھیلتے رہے۔کل پورے گاؤں کے سامنے یہ واقعات بیان کیے جائیں گے۔اس کمینے کی بدکار آتما تو اب ہمارے لیے بہت بڑا خطرہ بن چکی ہے۔سب سے پہلے تو ہمیں 786 نمبر کی گولیاں تلاش کرنا پڑیں گی اور یہ مسئلہ بھی اتنا آسان نہیں ہے۔''

سردار کے لہجے میں جھلکتی پریشانی دیکھ کر طارق کچھ سوچتے ہوئے بولا۔'' سردار! آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں یہ مسئلہ تو بڑی آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' سردار نے بے تابی سے پوچھا۔

''وہ ایسے کہ اگر خدانخواستہ ہمیں 786 نمبر کی گولیاں نہ مل سکیں تو پھر کسی بھی اسلحہ ساز سے یہ نمبر با آسانی گولیوں پر کندہ کروایا جا سکتا ہے۔''

''ارے واہ! کیا دماغ پایا ہے تم نے آج سے میرے مشیر تم ہو بلکہ آج کیا ابھی سے تمہیں ہر کام سرانجام دینا ہے۔ بولو اب کیا کیا جائے۔۔''

''سردار! میرا مشورہ تو یہ ہے کہ ابھی آرام کیا جائے۔ مجھے خدا تعالیٰ پر کامل بھروسہ ہے کہ آج رات اس پنڈت کی بدکار روح گاؤں کا رخ نہیں کرے گی کیونکہ نارائن چند کو ہڑپ کرنے کے بعد اس کی بھوک مٹ چکی ہو گی اور ویسے بھی پہرہ دینے کا کوئی فائدہ تو نہیں ہے جب تک ہم 786 نمبر کی گولیاں حاصل نہیں کر لیتے۔'' طارق نے سردار کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے تو پھر آج رات اللہ کے آسرے پر آرام کرتے ہیں صبح سویرے اس معاملے پر سوچیں گے۔''

سردار نے حتمی لہجے میں جواب دیا۔

☆☆☆

دوسرے دن تقریباً نو بجے جرگے کی کارروائی شروع ہو گئی۔ حاضرین جرگہ پورا واقعہ سن کر نارائن چند پر لعنت بھیجنے کے ساتھ ساتھ طارق اور آصف کو جی بھر کر داد دے رہے تھے انہیں امجد اور اس کے والدین کے افسوسناک انجام کا غم بھی پوری شدت کے ساتھ محسوس ہو رہا تھا۔

جرگے کی کارروائی کے بعد گاؤں کے اکلوتے اسلحہ ساز کو سردار نے 786 نمبر کی گولیاں کندہ کرنے کا حکم سنا دیا تھا۔ شام سے پہلے اسلحہ ساز نے تقریباً دو سو گولیاں کندہ کر کے سردار کے پاس پہنچا دیں۔

رات کا اندھیرا پھیلتے ہی گاؤں کے چاروں طرف مسلح نوجوان گھوم رہے تھے۔ جن کے پاس موجود جدید رائفلوں میں 786 نمبر کی گولیاں موجود تھیں۔ سردار خود بھی رائفل لے کر نوجوانوں کے ساتھ پہرہ دے رہا تھا۔ وہ سب بڑے جوش وخروش اور ولولے کے ساتھ آنے والی خوفناک بلا کے منتظر تھے۔

وقت رفتہ رفتہ کسی سست رفتار کیڑے کی طرح رینگ رہا تھا اور پہرے پر موجود نوجوان ایک نامعلوم قسم کی بے چینی محسوس کر رہے تھے مگر سردار ایک ایک نوجوان کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ طارق اور آصف بھی کندھے پر رائفلیں لٹکائے اپنے دوست امجد اور اس کے والدین کا انتقام لینے کے لیے بے تابی کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ نجانے آج رات کیوں ان دونوں کو شدت کے ساتھ امجد کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ رہ رہ کر انہیں نارائن چند کے یہ الفاظ یاد آ رہے تھے کہ'' پاجی! یہ خوفناک روپ امجد کا ہے لیکن آتما آپ کی ہے۔''

یہی سوچ ان دونوں کو افسردہ کر رہی تھی کہ آج رات ان کا دوست نجانے کتنی گولیوں کا نشانہ بنے گا۔ کاش اس پنڈت کی بدکار آتما ان کے دوست کے جسم میں داخل نہ ہوتی۔ صد حیف کہ اس بھیانک رات امجد نے مردہ بھیڑیے کی کھال نہ اتاری ہوتی۔ ان دونوں کے پاس سوائے افسوس کرنے کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ امجد کو اب کسی صورت میں بھی

واپس نہیں لایا جا سکتا تھا۔ جانے والے تو چلے جاتے ہیں یہ سوچے بغیر کہ پیچھے رہ جانے والوں کے ہاتھ میں صرف پچھتاوے رہ جائیں گے۔

اس وقت کوئی آدھی رات کا عمل تھا پہریداروں میں سے کچھ نوجوان مایوسی کا مظاہرہ کر رہے تھے اور چند ایک کی پلکیں نیند کے بوجھ سے جڑی جا رہی تھی۔ جب اچانک ان کی سماعتوں نے ایک دہشت ناک قسم کی غراہٹ آمیز آواز سنی اور خوف کی ایک سرد لہر ان کے جسموں میں سرایت کر گئی۔

یہ خوفناک غراہٹ سن کر سردار نے اپنے ہاتھ میں موجود الیکٹرک ٹارچ کی روشنی جب سامنے ڈالی تو مارے ڈر کے اس کے ہاتھ لرزنے لگے اور چند کمزور دل نوجوان بے ساختہ چیختے ہوئے واپس اپنے گھروں کی طرف دوڑ پڑے۔ سردار نے چلا کر انہیں رکنے کا حکم دیا مگر ان کے بھاگتے قدم رک نہ سکے۔ سردار نے جھنجلا کر باقی نوجوانوں کی طرف دیکھا تو وہ اس طرح ایک دوسرے کے بیچ گھسنے کی کوشش کر رہے تھے جیسے بھیڑیں بھیڑیے کو سامنے دیکھ کر کرتی ہیں۔

سردار کی ٹارچ والا ہاتھ بدستور لرز رہا تھا۔ خوفناک بلا لمبے لمبے دانت نکالے اور نوکیلے پنجے لہراتے ہوئے لمحہ بہ لمحہ ان کے قریب آتی جا رہی تھی۔ اس کی طویل قامتی اور پورے جسم پر گھنے بال کر دیکھ کر تمام پہریدار نوجوانوں کے ہوش وحواس جواب دیتے جا رہے تھے شاید اپنی پوری زندگی میں انہوں نے کبھی بھی ایسی خوفناک اور ڈراؤنی شکل نہیں دیکھی تھی۔ کنگ کانگ نما اس بلا کے منہ سے دہشت ناک قسم کی غراہٹیں تسلسل کے ساتھ نکل رہی تھیں۔

اچانک طارق امت کا مظاہرہ کرتے ہوئے چلایا" سردار یہی ہے وہ بدکار آتما جسے ہم نے کل رات جنگل میں دیکھا تھا۔ اس کی من پسند غذا انسانی جسم کے نازک اعضاء ہیں۔"

"گگ...... گولی..... چلاؤ طارق۔" سردار کی زبان سے بمشکل ایک جملہ نکلا۔

طارق نے ایک جوش اور ولولہ کے ساتھ آٹومیٹک رائفل کو سیدھا کیا اور بلٹ کھینچنے کے بعد ٹریگر دباتا چلا گیا۔ فضاء تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اٹھی۔ طارق کی ہمت اور جرات دیکھ کر دوسرے نوجوانوں کی رائفلیں بھی گولیاں اگلنے لگیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ خوفناک بلا لاکھڑاتی زمین پر گرتی چلی گئی۔ وہ کسی کٹے ہوئے سانڈ کی طرح زمین پر لوٹ رہی تھی۔

اس عفریت کو زمین پر لوٹتے دیکھ کر سردار سمیت تمام نوجوان ایک طمانیت محسوس

کر رہے تھے۔ سوائے طارق اور آصف کے جن کے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی اندر ہی اندر کوئی دکھ انہیں کاٹ رہا تھا۔ دونوں کی پلکیں آنسوؤں سے بھیگ چکی تھیں۔

جونہی اس خوفناک بلا کا جسم ساکت ہوا عین اسی وقت اس کے ساکت جسم سے دھوئیں کا ایک مرغولہ اٹھا اور رفتہ رفتہ کھلی فضاء میں تحلیل ہو گیا۔ اب اس بلا کی جگہ زمین پر امجد کا لہولہان اور بے حد وحرکت جسم پڑا ہوا تھا۔

طارق اور آصف دونوں بوجھل قدموں کے ساتھ آگے بڑھے اور امجد کے مردہ جسم کے قریب پہنچ کر سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں تیرتے آنسو ان کے اندر کے کرب کا اظہار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ امجد کا مردہ جسم اٹھائے گاؤں کا رخ کر رہے تھے۔ دوسرے دن امجد کی تدفین سے فارغ ہونے کے بعد گاؤں کے سردار نے تمام لوگوں کو ایک کھلی جگہ اکٹھا کیا اور ان کے سامنے نارائن چند کے والدین کلیان چند کی کہانی بیان کرتے ہوئے کہا" کئی برس پہلے ہمارے گاؤں میں کلیان چند نامی ایک جوگی آیا تھا جو کہ سفلی علوم سے بھی واقف تھا۔ وہ بدبخت اگر اس گندے علم کو صرف اپنی ذات تک محدود رکھتا تو اس وقت کا سردار یعنی میرا بابا کبھی بھی یہ حکم صادر نہ فرماتا کہ کلیان چند کو جنگل میں لے جا کر زندہ درگور کر دیا جائے۔ اس بدبخت نے گاؤں کی نوجوان لڑکیوں کو سفلی علوم کے ذریعے بے پردگی اور فحاشی کی ترغیب دینا شروع کر دی تھی اور یہ کام ایسا تھا کہ بابا جان نے مجبوراً اس کی موت کا حکم دے دیا تھا۔ کلیان چند کو زندہ درگور کرنے والوں میں امجد کا والد افضل خان پیش پیش تھا۔ تبھی وہ اور اس کی بیوی سب سے پہلے نارائن چند کے ظلم کا شکار ہوئے تھے۔ نارائن چند بدبخت مار آستین کا سانپ تھا

کاش بابا نے اس منحوس نارائن چند کے متعلق چھان بین کی ہوتی تو اسے کبھی بھی اپنے باپ کی بدکار آتما کو امجد کے ذریعے خوفناک روپ دینے کی مہلت نہ ملتی۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ نارائن چند اپنے باپ کی بدکار آتما سمیت جہنم رسید ہو چکا ہے۔

سرادر نے تمام تفصیل بیان کرنے کے بعد اہل گاؤں کو نارائن چند عرف شمروز خان کا مکان نذر آتش کرنے کا حکم بھی سنا دیا۔



شب تار

چھوٹی سی پہاڑی چوٹی پر واقع وہ پرانا ڈاک بنگلہ برطانوی طرز تعمیر کا نمونہ تھا۔ بنگلے کو چاروں طرف سے چیڑ اور دیودار کے دیوہیکل درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ حوادث زمانہ کا شکار ہوکر بنگلے کی چار دیواری کئی جگہوں سے منہدم ہوچکی تھی۔ دیوار کا جو حصہ گرنے سے محفوظ رہا تھا وہ تقریباً درختوں میں چھپ کر رہ گیا تھا۔

صدر دروازے کو چھوڑ کر کسی بھی طرف ڈاک بنگلے میں داخل ہوا جاسکتا تھا۔ چار دیواری کی طرح لان کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ خودرو گھاس اور جھاڑ جھنکار نے پورے لان پر تسلط جما رکھا تھا۔

برآمدے کے ٹوٹے پھوٹے اور شکستہ ستون بمشکل چھت کو سنبھالے ہوئے تھے۔ برآمدے اور بنگلے کی سرخ اینٹوں پر وقت نے گہرے نقوش ثبت کیے تھے۔ کبھی تو ان کا رنگ خاکستری ہوچکا تھا۔ کمروں کی کھڑکیوں کے بیشتر شیشے ٹوٹ چکے تھے اور جو سلامت تھے انہیں گردوغبار اور جالوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔

اسے ڈاک بنگلے کی بجائے بھوت بنگلہ کہنا زیادہ مناسب لگتا تھا۔ مگر میں اس گورے سیاح کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا جو وہاں ٹھہرنے پر مصر تھا۔ میں اس کا گائیڈ تھا اور وہ ٹورسٹ۔ میں اسے مشورے تو دے سکتا تھا لیکن زبردستی اس سے کوئی بات نہیں منوا سکتا تھا۔

پانچ ڈالرز یومیہ مزدوری میرے لیے کافی پرکشش آفر تھی۔ اس لیے میں بلاتردد اس برطانوی سیاح کا گائیڈ بننے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔ اس کا نام جارج اسٹیلے تھا اور عمر لگ بھگ تیس برس تھی۔

وہ نکلتے ہوئے قد کا ایک خوبرو شخص تھا۔ اس کے کندھوں تک پھیلے ہوئے سنہری بال

دھوپ میں سونے کی طرح چمکتے تھے۔ بھوری آنکھیں اس کے حوصلوں اور ولولوں کی ترجمان تھیں۔

وہ برطانیہ سے پاکستان سیاحت کی غرض سے آیا تھا مگر پیشے کے لحاظ سے وہ ایک صحافی تھا اور لندن میں ایک مشہور و معروف روزنامے سے منسلک تھا۔ غالباً وہ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ پر کتاب لکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے پرانی اور کھنڈر نما عمارات اس کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔

پہلے پہل تو میں اسے محض ایک ایڈونچر پسند شخص سمجھا تھا۔ لیکن جب اس سے بات چیت بڑھی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک سیاح ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ذہین و فطین صحافی بھی ہے۔ قلم کی دنیا میں برطانیہ جیسے ملک میں اس کا کافی شہرہ تھا۔ لوگ اس کے آرٹیکل اور دیگر معلوماتی تحاریر بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے۔ یہ تمام معلومات مجھے اس سے بات چیت کے دوران حاصل ہوئی تھیں۔ میں آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ انگلش میں اہل زبان کی طرح تو نہیں مگر صاف ستھری بول لیتا تھا۔ تاہم ابتداء میں مجھے کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا لیکن اب تو گائیڈ کا پیشہ اختیار کیے پانچ برس ہونے والے تھے۔ اس لیے انگلش بولنے میں مجھے کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی۔ ویسے بھی بی اے تک میں نے تعلیم ریگولر حاصل کی تھی۔ تاہم جارج اسٹیلے اردو زبان سمجھ لیتا تھا۔ گائیڈ کا پیشہ میں نے کسی مجبوری کے تحت اختیار نہیں کیا تھا بلکہ انتقاماً اختیار کیا تھا۔ اپنے کنجوس مکھی چوس باپ کو سبق سکھانے کے لیے میں گائیڈ تو کیا کارپوریشن کا بھنگی تک بننے کے لیے تیار تھا۔ میرا باپ کروڑپتی تھا مگر مجھے جیب خرچ کے لیے سو دو سو روپے دیتے ہوئے اس کی جان نکلتی تھی۔ جیب کی طرف رینگتے ہوئے اس کا ہاتھ اس طرح کانپتا تھا جیسے خدانخواستہ جیب میں روپیوں کی جگہ بچھو پڑے ہوں جو اسے ڈنک مار دیں گے۔

میری اور اس کی طبیعت میں بہت تضاد تھا۔ میں روپے پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھتا تھا جب کہ وہ ماتھے کا سیندور۔ میں بہترین کھانوں کا شوقین تھا مثلاً چکن کڑھائی، پلاؤ، بریانی، تکے، کباب وغیرہ جب کہ وہ سلاد اور چٹنی کو ہی بہترین خوراک سمجھتا تھا۔

لباس کے معاملے میں بھی وہ میرے مقابلے میں بہت ہی ادنیٰ قسم کا کپڑا پسند کیا کرتا تھا۔ دیکھنے والوں کو وہ کسی زاویے سے بھی کروڑپتی نہیں لگتا تھا بلکہ یوں سمجھ لیجیے حاتم طائی جتنا سخی تھا۔ میرا باپ اس سے بڑھ کر کنجوس تھا۔ میں دعوے کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ

اگر کنجوسوں کا عالمی مقابلہ منعقد کیا جائے تو فرسٹ پرائز میرے باپ کو ملے گا۔

متعدد بار میں اسے غصے میں باپ کی بجائے پاپ کہہ دیتا تھا لیکن وہ مطلق برا نہیں مناتا تھا۔ پاپ کو وہ پاپا کا اسم صغیر سمجھ کر اگنور کر دیتا تھا۔ باپ کی انہی کنجوسیوں سے تنگ آ کر آخر کار میں نے گائیڈ کا پیشہ اختیار کر لیا تھا وہ نادم ہونے کی بجائے خوش ہوا تھا کہ چلو بیٹا کسی کام سے تو لگا۔ جان پہچان کے لوگوں کو وہ بڑے فخریہ انداز میں میرے معزز پیشے کے متعلق بتایا کرتا تھا۔

میں اگر چاہتا تو باپ کا نام استعمال کر کے کسی بھی آفس میں اچھی جاب حاصل کر سکتا تھا مگر اس طرح میں اپنے باپ کو شرمندہ کرنے میں ناکام رہتا۔ گو کہ اسے شرمندہ کرنے میں ہنوز میں ناکام چلا آ رہا تھا لیکن دنیا امید پر قائم ہے بس یہی سوچ کر جیسے تیسے گائیڈ کا پیشہ جاری رکھے ہوئے تھا۔

☆☆☆

جارج اسٹیلے اس پرانے ڈاک بنگلے کو بہت ہی پرشوق نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ البتہ مجھ پر بوریت کے ساتھ ساتھ تھوڑا بہت خوف بھی طاری تھا۔ ڈاک بنگلے کی ویرانی دیکھ کر نجانے کیوں میرے دل میں انجانے وسوسے سر ابھار رہے تھے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی انہونی ہونے والی ہو۔

جارج اسٹیلے میری کیفیت سے بے خبر ڈاک بنگلے کے ایک کمرے کو چیک کرتا پھر رہا تھا۔ غالباً وہ رہائش رکھنے کے لیے مناسب کمرہ تلاش کر رہا تھا۔

میں لان میں رکھے ہوئے سامان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جب اچانک جارج نے مجھے پکارا۔ ''مسٹر سرمد! پلیز جلدی آیئے۔''

میں بادل نخواستہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف چل دیا۔ اس وقت وہ درمیان والے کمرے کے دروازے پر موجود تھا۔ اس کی پشت مجھے صاف نظر آ رہی تھی اور وہ جھانکنے کے انداز میں آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔

اس کے نزدیک پہنچ کر میں نے کمرے کے اندر ایک نگاہ ڈالی تو کمرے کا اندرونی منظر دیکھ کر میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کمرے کے پختہ فرش پر خشک چونے سے ایک دائرہ بنا ہوا تھا۔ جس کے اندر ایک انسانی کھوپڑی، مٹی کا ایک چراغ، لوبان اور اگربتیوں کا ایک

پیکٹ رکھا ہوا تھا۔

''یہ کیا ہے مسٹر سرمد! جارج اسٹیلے نے متحیر لہجے میں پوچھا۔

''یہ جگہ ہمارے ٹھہرنے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ مسٹر جارج۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''ہم کسی مصیبت میں بھی پھنس سکتے ہیں۔ یہاں کوئی شیطانی چکر چل رہا ہے۔ پلیز میری بات مانیے یہاں سے چلتے ہیں۔

''میں کچھ سمجھا نہیں۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟'' اس نے الجھے ہوئے انداز میں دوبارہ پوچھا۔

''دیکھیے مسٹر جارج۔'' میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔'' اس وقت شام کے چار بج چکے ہیں۔ ساڑھے چھ بجے سورج غروب ہو جائے گا اور پھر ہمارے لیے یہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ میں خطرے کو سر پر منڈلاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ یہاں کوئی شیطان کا پجاری کالی طاقتیں حاصل کرنے کے لیے جاپ کر رہا ہے۔ وہ ہماری مداخلت کو سخت ناپسند کرے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ ہم خواہ مخواہ کسی شیطانی طاقت سے دشمنی مول لے کر اپنا نقصان کر بیٹھیں۔''

''تو مسٹر سرمد۔'' وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں ایسی دقیانوسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ ہم یہاں سے کہیں نہیں جائیں گے بلکہ میں اس عجیب شخص سے ملنا بھی چاہوں گا جو یہاں جاپ کرنے کے لیے آتا ہے۔ یہ میرے لیے ایک انوکھا تجربہ ہوگا۔'' اتنا کہہ کر وہ دائرے کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی چیز کو چھیڑتا میں نے چلا کر کہا۔ ''رک جایئے جارج صاحب! پلیز دائرے کے اندر داخل ہونے کی کوشش مت کیجئے اور نہ ہی کسی چیز کو ہاتھ لگایئے ورنہ پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ یہ میں آپ کے بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں میرا اعتبار کیجئے، میں آپ کا گائیڈ ہوں اور گائیڈ کا مطلب آپ خوب سمجھتے ہیں۔''

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور پھر استہزائیہ انداز میں ہنسنے لگا۔ ''تم... تم جوک اچھا کر لیتے ہو لیکن میرا نام بھی جارج اسٹیلے ہے۔ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔'' وہ کھوپڑی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اگر آپ نے کھوپڑی کو چھو لیا تو پھر اس شخص سے کبھی نہیں مل پائیں گے۔'' اچانک میں نے پینترا بدلتے ہوئے کہا اور کھوپڑی کی طرف بڑھتا ہوا اس کا ہاتھ ایک دم رک

گیا۔

اب وہ متحیر انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے کندے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔'' میں سچ کہہ رہا ہوں۔ پلیز میرا یقین کیجیے۔ آپ نے اگر دائرے کے اندر قدم بھی رکھا تو یہ اس کے کام میں بے جا مداخلت ہوگی۔ ردعمل کے طور پر وہ ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا یا پھر یہاں نہیں آئے گا۔ پھر آپ کی اس سے ملنے کی خواہش کبھی بھی پوری نہیں ہو سکے گی۔''

بات اس کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ اسی لیے وہ بغیر کچھ کہے میرے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم اپنے رہنے کے لیے ایک کمرہ منتخب کر چکے تھے۔ یہ کمرہ ڈاک بنگلے کے دوسرے کمروں سے قدرے بہتر حالت میں تھا۔ ڈاک بنگلے میں کل چھ کمرے تھے۔ بنگلے کا احاطہ تقریباً دو کنال پر پھیلا ہوا تھا۔ اس لحاظ سے کمروں کی تعداد کم تھی۔ اتنی کھلی اور وسیع جگہ پر یہ چھ کمرے مناسب نہیں لگتے تھے۔ میں نے اس بات کا ذکر جب جارج سے کیا تو وہ پرجوش لہجے میں بولا۔'' تم مفت میں پریشان ہو رہے ہو مجھے تو اس قسم کی جگہیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ بھیڑ اور شور و غل سے دور نہایت پرسکون، یہاں تو عمر بتائی جا سکتی ہے۔ مسٹر سرمد۔''

'' آپ ٹھیک فرما رہے ہیں اگر میں بھوت یا بدروح ہوتا تو یقیناً رہنے کے لیے ایسی ہی جگہ کا انتخاب کرتا مگر میں انسان ہوں اور بدقسمتی سے تعلیم یافتہ بھی ہوں۔ اس لیے آپ کی باتوں سے نہیں بہل سکتا۔ کاش آپ یہاں رہنے کا ارادہ ترک کر دیتے۔'' میں نے ایک آہ خارج کرتے ہوئے جواب دیا۔

'' میں برطانیہ سے پاکستان کی مارکیٹیں دیکھنے کے لیے تو نہیں چلا تھا۔'' جارج حتی المقدور چہرہ بگاڑتے ہوئے بولا۔

'' مجھے معلوم ہے۔'' میں نے منہ پھیلاتے ہوئے جواب دیا۔'' آپ اتنی دور سے بھوت بنگلے اور قبرستان دیکھنے کے لیے آئے ہیں''۔

'' تم خواہ مخواہ ڈر رہے ہو، بھوت پریت کا تو وجود بھی نہیں ہے دنیا میں۔ ہم لوگ مریخ پر بسنے کی سوچ رہے ہیں اور تم لوگ ابھی تک بھوتوں کے چکر میں پڑے ہوئے ہو، دقیانوسی کہیں کے۔'' اس نے نفرت سے جواب دیا اور میں دانت پیس کر رہ گیا اگر میرے بس

میں ہوتا تو میں بلا زرد بھوت بن کر اس کو ہلکان کر دیتا تاہم میں نے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے کہا۔'' آپ مریخ پر کیوں جانا چاہتے ہیں؟''

'' ہم مریخ پر سیر کے لیے نہیں بلکہ اپنی فتح کے جھنڈے گاڑنے کے لیے جانا چاہتے ہیں۔''

'' میری طرف سے کہیں بھی جاؤ۔'' میں نے جھنجھلا کر جواب دیا اور لان میں رکھا ہوا سامان اٹھانے کے لیے چل دیا۔

کمرے میں سامان سیٹ کرتے کرتے شام ہو گئی۔ شام کے ملگجے اندھیرے میں ڈاک بنگلے کا ماحول ضرورت سے زیادہ ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ وہاں لائٹ کا انتظام سرے سے ہی موجود نہیں تھا۔ اس لیے ہم نے لالٹین جلائی تھی۔

جارج کے پاس ٹن پیک کھانا کافی مقدار میں موجود تھا تاہم کھانا گرم کرنے کے لیے مجھے خشک لکڑیوں کا بندوبست کرنا پڑا تھا جو میرے لیے خاصا دشوار کام تھا۔ جارج میرا ہاتھ بٹانے کی کوشش کر رہا تھا مگر میں نے کچھ سوچ کر اسے منع کر دیا تھا۔

ڈاک بنگلے میں ہمیں صرف پانی کی سہولت میسر تھی۔ بنگلے کے لان میں ایک طرف ایک پختہ حوض بنا ہوا تھا۔ جو شفاف پانی سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ پہاڑی علاقوں میں ویسے بھی بارشیں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ یہ حوض کچھ اس طرح بنایا گیا تھا کہ پہاڑی پر ہونے والی بارش کا بیشتر پانی اس حوض میں اکٹھا ہو جاتا تھا۔

ہفتے میں ایک آدھ بارش لازمی ہو جاتی تھی۔ اس لیے حوض کا پانی شفاف رہتا تھا ورنہ تو کھڑا ہوا پانی بہت جلدی اپنی رنگت اور ذائقہ کھو دیتا ہے۔

جارج کے پاس ضرورت کا تمام سامان موجود تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے گرما گرم کافی بھی تیار کر لی تھی۔ اس سرد رات میں کافی پینے کا اپنا لطف تھا۔ لالٹین کی زرد اور مریل سی روشنی کمرے میں چھائی ہوئی تاریکی سے حتی المقدور لڑنے کی کوشش کر رہی تھی مگر رات کچھ ضرورت سے زیادہ تاریک تھی۔ لالٹین کی روشنی میں کمرے کی دیواروں پر بننے والے ہم دونوں کے سائے بہت ڈراؤنے دکھائی دے رہے تھے۔ میرے دل میں رہ رہ کر ہول اٹھ رہے تھے لیکن جارج کے چہرے پر مجھے خوف کا شائبہ تک دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ شاید ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار تھا یا پھر.....

''جارج! کیا آپ کے پاس ہتھیار وغیرہ موجود ہے؟'' یونہی کسی خیال کے تحت میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا اور جارج نے منفی انداز میں سر ہلا دیا۔

''تو اس کا مطلب ہے کہ کسی بھی خطرے سے نمٹنے کے لیے ہمیں خالی ہاتھوں سے لڑنا پڑے گا؟''

''کیوں؟ کیا یہاں ڈاکو دھاوا بولنے والے ہیں۔''

اس نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

''آپ شاید اس پراسرار کھوپڑی اور دیگر سامان کو بھول چکے ہیں۔ ہمارے ساتھ کوئی بھی انہونی ہو سکتی ہے اپنی حفاظت کرنے کے لیے ہمیں ہتھیار کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

''مسٹر سرمد! وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔'' تم خواہ مخواہ فکر مند ہو رہے ہو، یہاں ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔ بہر کیف تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کسی بھی ممکنہ خطرے سے نمٹنے کے لیے میرے پاس بہت کچھ ہے۔''

''اوکے۔'' میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''رات کے نو بجنے والے ہیں اور میں سونا چاہوں گا۔ آپ شاید تھوڑی دیر مزید جاگیں گے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔'' تم سو جاؤ میں کچھ دیر لکھوں گا۔''

''اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو مجھے جگا دینا۔'' میں نے کمبل میں گھستے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆

رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب جارج نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔'' کک..... کون... کیا ہے؟'' اچانک جگائے جانے پر میں حواس باختہ ہو گیا تھا۔

''شش۔'' جارج نے آہستہ سے پکارا۔ ''اونچی آواز میں مت بولو، یہاں کوئی گڑبڑ شروع ہو چکی ہے۔ میں کافی دیر سے مختلف قسم کی آوازیں سن رہا ہوں۔''

''ٹائم کیا ہوا ہے؟'' میں نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''ساڑھے بارہ بج چکے ہیں۔''

''لالٹین کیوں بجھا رکھی ہے؟'' میں نے دوبارہ اسی انداز میں سوال کیا۔

''پاگل ہو گئے ہو کیا؟ روشنی دیکھ کر وہ ہماری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ مجھے تو کوئی

مجرم پیشہ لوگ لگتے ہیں۔ ٹھہرو میں دیکھتا ہوں۔'' وہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

''جارج!'' میں نے نیچی آواز میں اسے پکارا۔

''کیا ہے؟'' اس نے جھنجھلا کر پوچھا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ آنا چاہتا ہوں۔ تم اکیلے کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے ایک، ایک ہوتا ہے اور دو گیارہ۔'' روانی میں میں اسے ''آپ'' کی بجائے ''تم'' مخاطب کر بیٹھا تھا لیکن اس نے مطلق برا نہیں منایا تھا۔ عمر میں وہ مجھ سے بڑا ہونے کے باوجود ایک حقیقت پسند انسان تھا۔

''نہیں۔'' وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔'' میں تمہیں ایسی حماقت کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ہم میں سے ایک کو ان کی نظروں میں نہیں آنا چاہیے۔ اگر بفرض محال میں پھنس بھی گیا تو تم میری مدد کرنے کے لیے آزاد ہو گے۔''

بات معقول تھی اس لیے میری سمجھ میں آ گئی۔ جارج نے آہستگی سے دروازہ کھولا تھا مگر پھر بھی ایک معمولی سی چرچراہٹ کی آواز نے رات کے سکوت کو لمحہ بھر کے لیے مرتعش کر دیا تھا۔

کھلے دروازے سے ہوا ایک سرد جھونکا اندر داخل ہوا اور میں ایک جھرجھری لے کر رہ گیا۔ باہر رگوں میں لہو منجمد کر دینے والی سردی پڑ رہی تھی۔

جب جارج کو نکلے ہوئے چند لمحے گزر گئے تو نہ چاہتے ہوئے بھی میرے قدم بے اختیار دروازے کی طرف اٹھ گئے۔ ہتھیار کے طور پر میرے ہاتھوں میں ایک موٹی سی چھڑی نما لکڑی موجود تھی۔ جارج کی نصیحت کو میں نے وقتی طور پر بھلا دیا تھا۔

دروازے سے باہر نکلتے ہی سردی کی ایک تیز لہر میرے پورے وجود میں سرایت کر گئی لیکن میں پرجوش انداز میں دبے پاؤں آگے بڑھتا چلا گیا۔ سیدھا کمروں کے سامنے سے گزرنا میرے لیے خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لیے میں کونے والے کمرے کے سامنے گزرتے ہوئے بائیں ہاتھ مڑ گیا۔ یہ راستہ کمروں کے عقب کی جانب نکل رہا تھا۔ تمام کمروں کی پچھلی جانب لوہے کی گرل والی کھڑکیاں موجود تھیں۔ دن کے وقت میں کمروں کے عقب میں گھوم چکا تھا۔ وہاں قد آدم جھاڑیاں اور تین تین فٹ لمبی گھاس اگی ہوئی تھی۔ اس لیے میں

بڑی احتیاط کے ساتھ قدم اٹھا رہا تھا۔ قدموں کے نیچے آ کر گھاس کے ٹوٹنے کی آواز رات کے سناٹے میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

دل میرے پہلو میں پارے کی طرح اچھل رہا تھا اور چھڑی پر میری گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ درمیان والے کمرے کے عقب میں پہنچ کر میں یکدم ٹھٹک کر رک گیا۔ کمرے کی کھڑکی مجھ سے چند فٹ دور تھی۔ ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی لیکن ان کی کوئی بھی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ شاید کھڑکی بند تھی یا وہ بہت آہستگی کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔

میں رکوع کے انداز میں جھک کر آہستہ آہستہ کھڑکی کی طرف سرکنے لگا۔ کھڑکی کے عین نیچے پہنچ کر میں نے ایک لمحے کے لیے چاروں طرف نگاہ دوڑائی لیکن اندھیرے کی وجہ سے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک دور سے گیدڑوں کے چلانے کی آوازیں آنے لگیں اور میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ دوسرے لمحے میں کھڑکی کے نیچے بیٹھ چکا تھا۔ چند منٹ گزرنے کے باوجود جب کھڑکی کے نزدیک کسی قسم کی آواز پیدا نہ ہوئی تو میں نے آہستہ سے اٹھ کر اندر جھانکنے کی کوشش کی لیکن کھڑکی کے شیشوں پر جالے اور بے تحاشہ گرد جمی ہوئی تھی اس لیے مجھے کمرے کا اندرونی منظر دھند میں لپٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔ البتہ ان کی باتیں اب کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ بار بار کسی خزانے کا ذکر کر رہے تھے جو غالباً اسی ڈاک بنگلے میں کہیں پوشیدہ تھا۔

خزانے کا سن کر میرے خوف پر تجسس غالب آ چکا تھا۔ میں نے سرعت کے ساتھ کھڑکی کا بغور جائزہ لیا تو خوش قسمتی سے مجھے کھڑکی کے اوپری کونے میں اندر جھانکنے کے لیے ایک معقول سوراخ مل گیا۔ وہاں سے دو انچ کے قریب کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ ایڑیوں کے بل کھڑے ہو کر ایک بار پھر میں نے کمرے کے اندر جھانکنے کی کوشش کی اور میری یہ کوشش بار آور ثابت ہوئی۔ اب کمرے کا اندرونی منظر واضح دکھائی دینے لگا تھا۔

وہ چار افراد تھے اور چاروں شکل سے کافی سلجھے ہوئے اور تعلیم یافتہ نظر آ رہے تھے۔ کمرے میں لیمپ کی تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ گیس سے جلنے والا لیمپ تھا۔ وہ چاروں مسلح تھے اس لیے ان کے جرائم پیشہ ہونے میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی۔ "مسٹر رستم! ان میں سے ایک جو درمیانے قد کا تھا اور جس نے لیدر جیکٹ پہن رکھی تھی اپنے سامنے کھڑے

ہوئے دوسرے شخص سے مخاطب ہو کر بولا۔ "ہمیں تمام نقدی اور سونا یہاں سے نکال کر آپس میں تقسیم کر لینا چاہیے۔ حکومت اب اس بینک ڈکیتی کو بھول چکی ہوگی۔ ویسے بھی اس ملک میں اتنے زیادہ جرائم ہوتے ہیں کہ فائلیں ایک دوسرے کے نیچے دبتی چلی جاتی ہیں۔"

"نہیں!" رستم نامی شخص نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم شاید بھول رہے ہوں کہ اس بینک ڈکیتی میں ہمارے ہاتھوں کیشیئر کے ساتھ ساتھ منیجر بھی مارا گیا تھا۔ حکومت بینک ڈکیتی کو بھول سکتی ہے قاتلوں کو نہیں۔"

"تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیا وہ سونے کے بسکٹ اور کروڑوں روپے کی نقدی ہمیشہ اس منحوس ڈاک بنگلے میں چھپی رہے گی؟" تیسرا شخص جس نے بینائی کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ جھنجھلا کر بولا۔

"اس کا فیصلہ پروفیسر عارف کرے گا۔" رستم چوتھے شخص کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا جو ان تینوں سے لاتعلق ہو کر کمرے کے دروازے کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ اب خدا جانے وہ سچ مچ کا پروفیسر تھا یا صرف نام کا۔ "ٹھیک ہے۔" لیدر جیکٹ والا بھی پروفیسر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "کیوں پروفیسر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ ہمیں ڈکیتی کا مال بانٹ لینا چاہیے یا نہیں؟"

"ارے کون ہے وہاں؟" پروفیسر اپنے ساتھی کی بات کو ان سنی کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا اور میرا دل بے اختیار دھڑک اٹھا شاید جارج اپنی حماقت کی وجہ سے پروفیسر کی نظر میں آ گیا تھا۔

پھر چشم زدن میں وہ کچھ ہو گیا جس کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ جیکٹ والے نے کمرے کے دروازے پر بلا جھجک گولی داغ دی۔ ہلکی سی "ٹھک" کی آواز کے ساتھ جارج کی چیخ ابھری تھی۔ غالباً ریوالور کی نال پر سائیلنسر فٹ تھا اسی لیے گولی چلنے کی آواز پیدا نہیں ہوئی تھی۔

جارج کی چیخ سن کر بدحواسی کے عالم میں، میں برآمدے کی طرف دوڑ پڑا۔ اس وقت میں نے یہ خیال بھی نہیں رکھا تھا کہ میرے قدموں کی دھمک ان کے کانوں تک پہنچ سکتی ہے۔

"کمرے کے اس طرف بھی کوئی موجود ہے"۔ ان میں سے کوئی ایک چلا کر بولا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کھڑکی کا شیشہ ایک چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گیا تھا۔ شاید کھڑکی پر بھی گولی چلائی گئی تھی لیکن دھماکے کی آواز نہیں گونجی تھی۔ ان کے پاس سائیلنسر لگے ہتھیار تھے۔

اب جارج کی طرف سے جانا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ میں نے فوراً اپنا رخ تبدیل کیا اور ڈاک بنگلے کی عقبی دیوار کی طرف اندھا دھند دوڑ لگا دی۔ میری موجودگی سے بے خبر ہوتے ہی وہ شکاری کتوں کی طرف میرے پیچھے دوڑ پڑے تھے۔

''وہ عقبی دیوار کی طرف بھاگ رہا ہے۔'' مجھے اپنے عقب میں کسی کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی اور میں نے غیر ارادی طور پر چھلانگ لگا دی مجھے اپنے سامنے تین فٹ اونچی ٹوٹی ہوئی دیوار بخوبی نظر آ رہی تھی۔ میں دیوار کے اوپر سے گزرتا ہوا دوسری طرف ڈھلوان سطح پر گرا اور لڑھکنیاں کھاتا ہوا نیچے گیا۔

جس وقت میں نے چھلانگ لگائی تھی عین اسی وقت میرے دائیں بائیں سے تین چار گولیاں گزر گئی تھی لیکن خوش قسمتی سے میں محفوظ رہا تھا۔ ہموار سطح پر پہنچتے ہی میں نے دوبارہ اٹھ کر دوڑنا شروع کر دیا۔ وہ موٹی سے چھری بدستور میرے ہاتھ میں موجود تھی۔ اوپر سے مجھے تعاقب کرنے والوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ آوازوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ صرف دو ہیں۔ باقی کے دو غالباً جارج کے پاس رہ گئے تھے۔

میں دل ہی دل میں جارج کی سلامتی کی دعائیں مانگتا کسی مناسب پناہ گاہ کی تلاش میں بھاگ رہا تھا۔ انتہائی سردی ہونے کے باوجود میرے ماتھے پر پسینے کے قطرے رینگ رہے تھے۔ شاید یہ موت کا خوف تھا یا زندگی بچانے کے لیے کسی جدوجہد کا نتیجہ بہرکیف میں پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ لڑھکنے کے دوران مجھے چند ایک چوٹیں بھی آئی تھیں۔

کہتے ہیں جان پر بن آئے تو چیونٹی بھی کاٹنے لگتی ہے اور بلی شیر بن جاتی ہے۔ آخر کار پندرہ بیس منٹ کی تگ و دو کے بعد مجھے چھپنے کے لیے ایک مناسب جگہ مل گئی۔ یہ ایک قدرتی گھاٹی تھی تین اطراف سے اسے قدم آدم جھاڑیوں نے گھیر رکھا تھا اور چوتھی جانب صرف پتھریلی زمین تھی۔ میں گھاٹی میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ ہتھیار کے طور پر میرے ہاتھوں میں صرف وہی چھری تھی۔

جہاں مقابلے میں خودکار ہتھیار ہوں وہاں چھری بے حیثیت ہو کر رہ جاتی ہے لیکن مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق مجھے اسی چھری سے کام لینا تھا۔ تعاقب کرنے والوں کی آوازیں مجھے کبھی بالکل نزدیک سے سنائی دینے لگتی تھی اور کبھی دور چلی جاتی تھیں۔ وہ میری تلاش میں آس پاس کا علاقہ چھانتے پھر رہے تھے۔

میں نے چھری کو مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا۔ کسی بھی لمحے ان میں سے کوئی ایک میرے سر پر پہنچ سکتا تھا۔

اچانک گھاٹی کے قریب مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور میرے اعصاب یک دم تن گئے۔ میں نے گھاٹی سے سر نکال کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو مجھے چند گز کے فاصلے پر ایک انسانی ہیولا سا دکھائی دینے لگا۔

کافی دیر اندھیرے میں رہنے کی وجہ سے میری آنکھیں اب تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ میری نگاہیں اس ہیولے پر جمی ہوئی تھی لیکن وہ شاید اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنے کی ٹھانے ہوئے تھا۔ اس کا دوسرا ساتھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ غالباً وہ دونوں الگ الگ ہو کر مجھے تلاش کر رہے تھے۔

یکایک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور میں نے رسک لینے کا فیصلہ کر لیا۔ گھاٹی میں چھپے چھپے میں تنگ آ چکا تھا۔ ترکیب ناکام ہونے کی صورت میں میری جان بھی جا سکتی تھی اور کامیاب ہونے کی صورت میں، میں اس پر قابو پا سکتا تھا۔ میں نے تمام احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ہاتھ میں ایک درمیانے سائز کا پتھر اٹھایا اور بغیر آواز پیدا کیے گھاٹی کے کنارے پر چڑھ گیا۔

وہ چند قدم کے فاصلے پر موجود میرے طرف پشت کیے سامنے دھیان لگائے ہوئے تھا۔ میں نے چھری کو زمین پر رکھ کر پتھر کو مضبوطی سے دائیں ہاتھ میں پکڑا اور اللہ کا نام لے کر اس کی پیٹھ کا نشانہ لیتے ہوئے پتھر کو چھوڑ دیا۔ پتھر کسی میزائل کی طرف میرے ہاتھ سے نکلا اور سیدھا اس کی پیٹھ سے جا ٹکرایا۔

دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ دھپ سے پتھریلی زمین پر گر پڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میں نے چیتے کی طرح اپنی جگہ سے جست لگائی اور اس کے اوپر جا پڑا۔ پتھر کھا کر وہ پہلے ہی نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا رہی سہی کسر میں نے پوری کر ڈالی تھی۔ اب وہ طویل وقفے کے لیے بے ہوش ہو چکا تھا۔

میں نے پھرتی سے اس کا ریوالور اٹھایا اور پھر اسے گھسیٹ کر گھاٹ میں پھینک دیا۔ میں نے ریوالور کو چیک کیا وہ پوری طرح لوڈ تھا۔ مجھ پر گولیاں چلانے کے بعد یقیناً اسے دوبارہ لوڈ کیا گیا تھا، میں گھاٹی کے قریب ایک گھنی جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

جلد یا بدیر اس کا دوسرا ساتھی پہنچنے والا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے کانوں تک اپنے ساتھی کی چیخ کی آواز ضرور پہنچی ہوگی۔ مجھ پر ایک ایک لمحہ قیامت بن کر گزر رہا تھا۔ ریوالور کو میں نے فائر کرنے والے انداز میں پکڑ رکھا تھا۔

''پروفیسر! تم ٹھیک تو ہو نا؟'' یکا یک میرے کانوں میں بے ہوش ہونے والے کے دوسرے ساتھی کی آواز پڑی اور میرے اعصاب ایک بار پھر تن گئے۔ میں اس پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ میں گولی چلا کر با آسانی اسے زخمی کر سکتا تھا اور یہی میں کرنے والا تھا۔

وہ اپنے ساتھی کو آوازیں دیتا ہوا کھائی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ جواب نہ ملنے کی وجہ سے وہ پریشان تھا۔ میں اس تاریک رات میں اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا تاہم میں نے یہ اندازہ اس کی پریشان کن آواز سن کر لگایا تھا۔

وہ کھائی کے قریب پہنچ کر ایکدم رک گیا اور جھاڑیوں کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ میں ایکدم چوکنا ہو گیا۔ کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میں اگر چاہتا تو اسے گولی مار کر با آسانی ہلاک کر سکتا تھا لیکن بلاوجہ کی خون ریزی مجھے پسند نہیں تھی وہ اگر ڈاکو اور قاتل تھا تو قانون کے لیے تھا۔

چند لمحے کھائی کے قریب ٹھہرنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا بالکل میرے قریب پہنچ گیا۔ اب وہ جھاڑیوں میں جھانکتا پھر رہا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان چند فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں ایک خوفناک ریوالور واضح نظر آ رہا تھا۔

وہ واپس پلٹنے والا ہی تھا۔ میرے پاس فیصلہ کرنے کے لیے صرف چند سیکنڈ رہ گئے تھے۔ اتنے قریب سے اس پر گولی چلانا میرے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ جوابی فائر کر سکتا تھا۔ البتہ میں اسے ہلاک کرنا چاہتا تو یہ میرے لیے بہترین موقع تھا مگر مجھے صرف اسے بے ہوش کرنا تھا۔

ایک سیکنڈ کے اندر میں نے ایک خطرناک فیصلہ کیا اور پھر نتیجے کی پرواہ کیے بغیر اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس اچانک ٹوٹنے والی افتاد سے وہ گھبرا گیا تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور وہ میرے نیچے دبا خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میں نے جھنجھلا کر زور سے ریوالور کا دستہ اس کے سر پر دے مارا۔ اس کے منہ سے ایک کراہ نکلی اور پھر اس کا جسم ڈھیلا پڑتا گیا۔

دوسرے ہی لمحہ وہ اپنے ساتھی کی طرح نڈھال ہو چکا تھا۔ میں نے اسے بھی گھسیٹ

کر کھائی میں پھینک دیا۔ تھوڑی دیر بعد میں ان دونوں کو آپس میں اس طرح باندھ چکا تھا کہ ہوش میں آنے کے بعد وہ حرکت کرنے سے قاصر رہتے۔ ایک دوسرے کے ساتھ ان کی پشت جڑی ہوئی تھی اور دونوں کے ہاتھ پشت کے پیچھے ایک ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ دونوں کے پاؤں کے ساتھ بھی میں نے یہی سلوک کیا تھا۔ باندھنے کا یہ سارا عمل ان دونوں کی قمیصیں پھاڑ کر سرانجام دیا گیا تھا۔

اب میرے پاس ایک کی بجائے دو ریوالور موجود تھے اور میں تقریباً دوڑنے کے انداز میں ڈاک بنگلے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ٹوٹی ہوئی دیوار کے پاس پہنچ کر میں ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر دبے پاؤں چلتا ہوا اسی کمرے کی طرف بڑھنے لگا جس میں ڈیڑھ دو گھنٹے قبل وہ چاروں موجود تھے۔

پہلے کی طرح میں رکوع کے انداز میں سرکتا ہوا کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ معاً میرے کانوں میں جارج کی آواز پڑی اور میرے پورے وجود میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ زندہ تھا اور وہ دونوں اس سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔

مجھے کسی بھی طرح ان دونوں پر قابو پا کر جارج کو چھڑانا تھا۔ اگر جارج کو کچھ ہو جاتا تو برٹش ایمبسی مجھے کبھی بھی معاف نہ کرتی۔

میں نے بغیر آہٹ پیدا کیے کھڑکی کے اندر جھانکا اور پھر فوراً سر نیچے کر لیا۔ ان دونوں کا رخ کھڑکی کی طرف تھا۔ ان میں سے رستم نامی شخص کے ہاتھ میں ریوالور موجود تھا البتہ چشمے والا شخص خالی ہاتھ تھا شاید اس نے اپنا ریوالور جیب میں ڈال رکھا تھا۔

کھڑکی سے ان پر فائر کرنا جارج کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا تاہم برآمدے میں جا کر کھلے دروازے سے ان پر قابو پانے کا رسک لیا جا سکتا تھا۔

چند لمحوں کے بعد میں برآمدے میں موجود تھا۔ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر کمرے کے کھلے دروازے سے روشنی برآمدے کے فرش پر پڑ رہی تھی۔ میں نے دونوں ریوالور ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام رکھے تھے اور کمرے کی دیوار کے ساتھ چپک کر دبے پاؤں آگے کی طرف سرک رہا تھا۔

دروازے کے بالکل نزدیک پہنچ کر میں نے سر ٹیڑھا کر کے ایک ثانیے کے لیے اندر کا جائزہ لیا تو وہ دونوں بدستور کھڑکی کی طرف متوجہ تھے۔ ان پر وار کرنے کے لیے یہ اچھا

موقع تھا۔ ویسے بھی میرے پاس سوچنے کے لیے کوئی وقت نہیں تھا۔ میں نے رستم کے ریوالور والے ہاتھ کا نشانہ لے کر فوراً فائر جھونک دیا۔ ہلکی سی ''ٹھک'' کی آواز کے ساتھ گولی سیدھی اس کے ہاتھ پر لگی تھی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کمرے کے فرش پر گر چکا تھا اور اس کے منہ سے ایک چیخ بھی خارج ہوگئی تھی۔

اس اچانک پڑنے والی افتاد نے ان دونوں کو ایک لمحے کے لیے بوکھلا دیا تھا۔ میں آندھی اور طوفان کی طرف کمرے میں داخل ہوا اور بارعب آواز میں بولا۔ ''خبردار! ہاتھ اوپر کرلو کوئی بھی غلط حرکت کی تو گولیوں سے چھلنی ہو جاؤ گے۔ تمہیں چاروں طرف سے پولیس نے گھیر رکھا ہے۔''

ان دونوں نے فوراً میکانکی انداز میں ہاتھ کھڑے کر لیے تھے اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

''ویل ڈن مسٹر مرد ویل ڈن۔'' جارج اسٹیلے مجھے دیکھ کر پرمسرت آواز میں بولا اور آگے بڑھ کر فرش پر پڑا ہوا ریوالور اٹھالیا۔

چشمے والے کی جیب سے میں نے ریوالور نکال لیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم انہیں مضبوطی سے باندھ چکے تھے۔ جارج بار بار میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ اس کے زخمی بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی جو غالباً رستم اور اس کے ساتھی نے باندھی تھی۔

پولیس کو میں نے جارج اسٹیلے سے موبائل لے کر مطلع کر دیا تھا۔ میں اور جارج اس وقت کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ صبح کا اجالا بھی ابھی پوری طرح نہیں پھیلا تھا مگر پولیس والوں کو موبائل پہنچ چکی تھی۔

پولیس کو میں نے گھاٹی میں پڑے ہوئے مجرموں کے متعلق بھی بتا دیا تھا۔

اتنا بڑا خزانہ واپس ملنے کی خوشی میں حکومت نے مجھے اور جارج اسٹیلے کو دس دس لاکھ روپے کی رقم بطور انعام دی تھی۔ جارج نے انعام کی رقم زبردستی مجھے دے دی تھی تاہم میں نے اپنی طرف سے انکار کیا تھا مگر جارج نجانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا ہمیشہ اپنی بات منوا کر ہی رہتا تھا۔

اب میرا باپ مجھ سے بیس لاکھ روپے کی رقم ہتھیانے کے چکر میں ہے۔ بار بار میری منتیں کر رہا ہے لیکن میں سنی ان سنی کر دیتا ہوں۔ ایسے باپ کو روپے میں کیسے دوں گا؟



باکسر

ممبئی کا مشہور و معروف باکسنگ ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے تمام شہر اس ہال میں سمٹ آیا ہو۔ تمام سیٹیں بک ہو چکی تھیں۔ تماشائیوں میں زندگی کے ہر شعبے سے متعلق لوگ موجود تھے اور بڑی بے صبری کے ساتھ خالی رنگ کو دیکھ رہے تھے۔ جہاں چند لمحوں کے بعد باکسنگ کا ایک عظیم الشان مقابلہ شروع ہونے والا تھا۔

اچانک ایک من چلے نوجوان نے منہ سے سیٹی کی آواز نکالی اور پھر تمام ہال سیٹیوں اور ہاؤ ہو کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ لوگ چلا چلا کر مقابلہ شروع کرنے پر اصرار کر رہے تھے۔ اس نازک صورتحال کو دیکھ کر ایک تیز و طرار اناؤنسر آگے بڑھا اور جلدی سے مائیک سنبھال کر بولا۔ ''معزز لیڈیز اینڈ جنٹل مین، میں دل کی گہرائیوں سے آپ تمام ناظرین کا سواگت کرتا ہوں۔''

''ارے بیوڑو! سواگت کو گولی مارو، اپن مقابلہ دیکھنا مانگتا ہے۔ کھالی پیلی ٹائم مت کھراب کرو۔''

ہال کے ایک کونے سے کسی موالی کی آواز گونجی اور اناؤنسر سٹپٹا کر رہ گیا لیکن جلد ہی وہ سنبھل کر دوبارہ بولا ''معزز حضرات! صرف چند منٹ اور صبر کیجیے۔ بس مقابلہ شروع ہوا چاہتا ہے۔ شہریار احمد اور مائیکل جانسن تشریف لانے والے ہیں۔''

''وڑی ہاکٹر لوگ کدھر مر گیانی؟'' ایک مارواڑی سیٹھ اپنی نشست سے اٹھ کر چلایا۔

''دھیرج رکھیے سیٹھ صاحب! بس صرف تھوڑا سا اور انتظار......؟''

اس سے پہلے کہ اناؤنسر کا جملہ مکمل ہوتا اس کے عقب میں موجود دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھلا اور شہریار احمد باکسرز کے مخصوص لباس میں اندر داخل ہوا۔ مائیکل جانسن اس کے

پیچھے پیچھے تھا۔ دونوں کے ساتھ کوچز موجود تھے۔ اناؤنسر نے دونوں باکسرز کو دیکھ کر مقابلہ شروع ہونے کی اناؤنسمنٹ کی اور ہال میں ایک بار پھر شور وغل کی آوازیں گونجنے لگیں۔ سب سے پہلے شہر یار احمد تماشائیوں کی چیخ وپکار کو نظر انداز کرتا ہوا چھلانگ لگا کر رنگ میں داخل ہوا اور اپنا ریشمی گاؤن اتار کر ایک نزدیکی نشست کی طرف اچھال دیا جس پر ایک نورانی چہرے والا بزرگ شخص بیٹھا ہوا تھا۔

بزرگ نے اچانک کر گاؤن کو پکڑا اور لپیٹ کر اپنی جھولی میں رکھ دیا۔ شہر یار نے ایک لمحے کے لیے ٹکٹکی باندھ کر بزرگ کی طرف دیکھا اور مطمئن انداز میں ہاتھوں میں چڑھائے ہوئے گلوز درست کرنے میں لگ گیا۔

رنگ کے دوسرے کونے میں مائیکل جانسن گاؤن اتارنے کے بعد اپنے ہیڈ گارڈ کو تھپتھپانے میں مصروف تھا۔ دونوں کا یہ تیسرا مقابلہ تھا پہلے دونوں مقابلوں میں شہر یار اسے شکست دے چکا تھا لیکن اس بار مائیکل خوب پریکٹس کرنے کے بعد رنگ میں اترا تھا۔ اسے اپنی پہلی شکستوں کا سخت ملال تھا۔ اس لیے اس کے کرخت چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی اور آنکھوں سے انتقام کے شعلے سے لپکتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ آج وہ گھر سے یہ تہیہ کر کے نکلا تھا کہ ہر صورت میں اپنے پرانے حریف کو شکست دے کر واپس لوٹے گا۔ چاہے اس کے لیے اسے فاؤل پلے سے کام کیوں نہ لینا پڑے۔

رنگ کے عین سامنے ایک لمبی سی ٹیبل کے پیچھے جج صاحبان تشریف فرما تھے جن میں سے دو کا تعلق ہندو مذہب سے تھا جب کہ تیسرا جج ایک مسلمان تھا۔ ریفری ایک درمیانے قد کا ہندو تھا جو خود بھی باکسر رہ چکا تھا۔ دونوں باکسرز کو ریفری نے اپنے قریب بلایا اور انہیں ہدایات دینے میں مصروف ہو گیا۔

پہلے راؤنڈ کی بیل بجی اور کھیل شروع ہو گیا۔ اب ہال میں گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ تمام تماشائیوں کی نگاہیں باکسرز پر جمی ہوئی تھیں۔ مائیکل کافی جارحیت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ تاک تاک کر شہر یار کے چہرے پر پنچ لگانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن شہر یار اس کے ہر حملے کو ناکامی سے دوچار کر رہا تھا۔ مائیکل کے پنچ کبھی شہر یار کے گلوز سے ٹکرا جاتے تو کبھی اس کے کندھوں سے، راؤنڈ ختم ہونے تک وہ شہر یار کے چہرے کو چھو بھی نہیں سکا تھا۔

تاہم پہلے راؤنڈ میں مائیکل ایک پوائنٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جب

کہ شہر یار کو کوئی پوائنٹ نہیں ملا تھا کیونکہ پہلے راؤنڈ میں اس نے صرف دفاع کرنے پر اکتفا کیا تھا۔

جب پہلا راؤنڈ ختم ہوا تو وہ بزرگ شخص اپنی سیٹ سے اٹھ کر رنگ کے قریب پہنچا اور شہر یار کی پیٹھ پر تھپکی دینے کے بعد بولا۔ ''بیٹے، دوسرے راؤنڈ میں کھیل ختم کرنے کی کوشش کرنا۔ دائیں ہاتھ سے پنچ لگانا اور بایاں ہاتھ اپنے دفاع کے لیے استعمال کرنا سمجھ گئے ہو ناں۔؟''

شہر یار نے اثبات میں سر ہلا دیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ دوسرے راؤنڈ کی بیل بج چکی تھی۔ شہر یار کے دائیں بازو پر ایک تعویز بندھا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔ اس تعویذ کے متعلق شہر یار کے علاوہ صرف وہ بزرگ شخص حشمت علی شاہ صاحب ہی جانتے تھے کیونکہ یہ تعویذ انہی کا دیا ہوا تھا۔

دوسرے راؤنڈ میں شہر یار نے دفاع کو مدنظر رکھتے ہوئے مائیکل کے چہرے کو نشانہ بنایا اور یکے بعد دیگرے تین مکے اس کے چہرے پر جڑ دیئے۔ مائیکل الٹے قدموں پیچھے ہٹتے ہٹتے رنگ کی رسیوں سے جا ٹکرایا اور ہال تماشائیوں کے شور وغل سے گونج اٹھا وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر شہر یار کو داد دے رہے تھے۔

شہر یار سے مکے کھانے کے بعد مائیکل بپھرے ہوئے درندے کی طرح آگے بڑھا اور پلک جھپکنے کی دیر میں شہر یار کی ٹھوڑی کے نیچے ایک بھرپور پنچ لگایا۔ ایک لمحے کے لیے شہر یار کی آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچے اور پھر وہ رنگ میں گرتا چلا گیا۔ ریفری نے اسے گرتا دیکھ کر انگلی کھڑی کر کے گنتی شروع کر دی۔

باریش بزرگ کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آ رہے تھے اور وہ بے چارگی کے عالم میں ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ تماشائیوں نے پورے ہال کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ وہی لوگ جو ایک لمحہ قبل شہر یار کو چلا چلا کر داد دے رہے تھے اب مائیکل کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔

ریفری کی گنتی ابھی بمشکل پانچ تک پہنچی تھی کہ شہر یار یکا یک اٹھ کر دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا تاہم انتہائی قوت برداشت کا حامل ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر اذیت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ شہر یار کو دوبارہ کھڑا ہوتے دیکھ کر باریش بزرگ کے چہرے پر ایک آسودہ سی طمانیت پھیل گئی۔

باکسنگ کے اصولوں کے مطابق جب ریفری کی گنتی آٹھ تک پہنچی تو اس کی زبان سے دوبارہ ''Box'' کا لفظ ادا ہوا شہریار بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے حریف کی طرف بڑھا۔ ہال میں موجود تماشائیوں کی سانسیں اتھل پتھل ہونے لگیں کیونکہ وہ شہریار کے اس جارحانہ انداز سے واقف تھے۔

مائیکل نے جھکائی دے کر شہریار کے متوقع حملے سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن بچ نہ سکا۔ شہریار کا تعویذ والا بازو ہوا میں بلند ہوا اور پوری قوت سے اس کا فولادی مکا مائیکل کے جبڑے پر پڑا اور وہ تقریباً اچھل کر رنگ کی رسیوں سے ٹکرانے کے بعد واپس شہریار کی طرف اتنی تیزی کے ساتھ آیا جس طرح دیوار پر گیند مارنے سے وہ پلٹ کر فاعل کی طرف واپس لوٹتی ہے۔

مائیکل ابھی سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ شہریار کا دوسرا مکا اتنی طاقت کے ساتھ اس کی پیشانی پر پڑا کہ وہ دوبارہ کسی گیند کی طرح لڑھکتا ہوا رنگ کی رسیوں سے ٹکرایا اور پھر اچھل کر رنگ سے باہر جا پڑا۔ ہال میں موجود بعض خواتین کے منہ سے بے ساختہ چیخیں نکل گئیں اور ریفری نے انگلی اٹھا کر گنتی شروع کر دی۔

''ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔'' حتیٰ کہ ریفری کی گنتی دس تک پہنچ کر رک گئی مگر مائیکل کے جسم میں جنبش تک نہ ہوئی۔ شاید وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

میڈیکل کے شعبے سے متعلق دو افراد بھاگتے ہوئے مائیکل تک پہنچے۔ ڈاکٹر نے بڑی سرعت کے ساتھ اس کی نبض چیک کی اور پھر چلا کر اسٹریچر منگوایا۔ دوسرے لمحے دو افراد مائیکل کو اسٹریچر پر لادے بھاگتے ہوئے ہال سے باہر نکل گئے۔

شہریار احمد نے تیسرا مقابلہ اپنے حریف کو ناک آؤٹ کر کے جیت لیا تھا۔ حشمت علی شاہ اپنی سیٹ سے اٹھا اور شہریار کے قریب پہنچ کر پُرمسرت لہجے میں بولا

''جیت مبارک ہو بیٹے آج میں بہت خوش ہوں۔''

''شاہ جی! یہ سب آپ کی مہربانی اور اوپر والے کا کام ہے ورنہ میں کس قابل ہوں۔'' اس نے انکساری سے جواب دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ چیمپئن ٹرافی اور انعامی چیک وصول کرنے کے بعد شاہ صاحب کے ساتھ باہر نکل رہا تھا۔

☆☆☆

شکست بظاہر ایک چھوٹا سا لفظ ہے لیکن کبھی کبھار یہ چار حرفی لفظ بڑے بڑے طوفانوں کا پیش خیمہ بن جایا کرتا ہے۔ شکست کو قبول کر لینا اتنا آسان کام نہیں ہے یہ بڑے دل گردے کا کام ہے۔ دنیا میں آپ کو ایسے بہت کم لوگ ملیں گے جو اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے شکست کو ہنس کر گلے لگا لیتے ہیں ورنہ تو شکست خوردہ شخص اور زخمی شیر ایک جیسے خطرناک ہوتے ہیں۔

مائیکل جانسن بھی اپنی شکست پر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ شہریار نے بھرے ہال میں ہزاروں لوگوں کے سامنے اسے ناک آؤٹ کر کے اس قدر مشتعل کر دیا تھا کہ اگر اس کا بس چلتا تو وہ شہریار کو کچا چبا جاتا۔

ہاسپٹل سے ڈسچارج ہونے کے بعد وہ شب و روز شہریار سے بدلہ لینے کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔ انسانی دماغ پر جب کسی سے انتقام لینے کا جذبہ حاوی ہو جائے تو اس کی سوچیں خود بخود منفی انداز اختیار کر لیتی ہیں اور انسان انتقام کے ایسے ایسے گھناؤنے طریقے سوچنے لگتا ہے جن کا اخلاق و اقدار سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ مائیکل کا دماغ بھی ایسی ہی گھناؤنی سوچوں کا مرکز بن چکا تھا اسے معلوم ہو گیا تھا کہ بغیر کسی Cheating کے وہ کبھی بھی شہریار سے نہیں جیت سکتا۔

وہ انہی سوچوں میں گم بستر پر لیٹا تھا کہ اچانک مین گیٹ کی بیل بج اٹھی۔ گھنٹی کی آواز سن کر اس نے ایک ملازم کو گیٹ کھولنے کے لیے کہہ دیا۔ ایک لمحہ بعد اس کے بچپن کا دوست رودی سکسینہ کمرے میں داخل ہوا اور چہرے پر مسکراہٹ سجا کر بولا۔

''ہیلو مائیکل کیا حال ہے؟ گنگا میا کی قسم تیری شکست دیکھ کر میرے کو بڑا دکھ ہوا ہے رے۔ دل چاہتا ہے سالے شہریار کو کھلاص کر ڈالوں پر اپن اس سے ڈرتا بھی تو بہت ہے ناں۔''

مائیکل نے گھور کر اسے دیکھا اور پھر بڑے کرخت لہجے میں بولا۔ ''تو بے شک شہریار سے ڈرتا رہ لیکن میں اس سالے کو نہیں چھوڑوں گا۔ میں اپنی ہر شکست کا بدلہ لوں گا چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔''

''اے مائیکل پریشان کاہے کو ہوتا ہے۔ اپن ہے ناں تیرے ساتھ، تیرے کو چنتا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپن تیرے کو کتنی بار سمجھایا کہ تیزی نہیں دکھانے کا ورنہ گیم بگڑ

جا تا ہے سالے۔'' روی کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

'' دیکھ روی تو میرا دوست ہے ناں۔تو پھر کوئی ترکیب سوچ شہر یار سے بدلہ لینے کی، ورنہ میرے اندر لگی ہوئی آگ مجھے ہی جلا ڈالے گی'' اس نے روی کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا۔روی نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر بڑے پر اعتماد انداز سے بولا۔'' ایک دم پرفیکٹ پلان، اپن تیرے کو بابا جوگندر ناتھ کے پاس لے جاتا ہے۔اپن کو یقین ہے کہ وہ تیرا مسئلہ حل کر دے گا لیکن؟''

'' لیکن کیا؟ جلدی بتاؤ یار۔'' مائیکل اس پر چڑھ دوڑا۔

'' دیکھ مائیکل اپن کو تیری یہی بات سالا گولی کی مافک لگتا ہے۔سالے بیچ میں گھس کر بات کا مزا کھراب کر دیتا ہے۔ پہلے میری پوری بات سن بعد میں تو جو بولے گا اپن ویسے ہی کرے گا۔ اپن کہہ رہا تھا کہ وہ سالا جوگندر ناتھ پھوکٹ میں کسی کام کا نہیں کرتا۔حرامی فیس بہت زیادہ مانگتا ہے۔''

'' تو فیس کی فکر مت کر میں اسے منہ مانگی فیس دوں گا لیکن کام پرفیکٹ ہونا چاہیے'' مائیکل نے حسب عادت جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

'' بالکل پرفیکٹ ہوگا۔ تیرے کو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کام اگر تیری مرضی کے مافک نہ ہوا تو اپن کی منڈی کاٹ کر کسی گٹر میں پھینک دینا۔''

'' تو پھر چلو آج ہی بابا جوگندر ناتھ سے ملتے ہیں۔'' مائیکل حتمی انداز میں اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں مائیکل کی شاندار گاڑی میں بیٹھ کر مین گیٹ کراس کرتے ہوئے بڑی سڑک پر پہنچ گئے۔ ڈرائیونگ مائیکل خود کر رہا تھا۔

تقریباً آدھا گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد وہ دونوں ایک پرانی اور شکستہ سی حویلی کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ حویلی ایک بالکل الگ تھلگ جگہ پر واقع تھی۔ حویلی کے اردگرد جھنکار اور خود رو جنگلی پودوں کی بہتات تھی۔ دن کے وقت بھی یہ حویلی بڑی پراسرار لگ رہی تھی۔حویلی کے آس پاس کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ چاروں طرف ایک گہرا سکوت اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔حویلی کی حالت اور ماحول کی پراسراریت دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو مائیکل کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں لیکن پھر وہ کوشش کر کے بولا۔'' روی۔یہ۔یہ تو مجھے کہاں لے آیا ہے مجھے تو یہ حویلی بھوتوں اور چڑیلوں کا مسکن نظر آ رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے سینکڑوں نادیدہ

آنکھیں ہمیں دیکھ رہی ہوں۔ مجھے اپنے بدن پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہو رہی ہیں۔کہیں یہ نہ ہو کہ ہم کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں۔''

'' دیکھ تو آرام سے کھڑے رہ ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اپن بیل بجاتا ہے۔ بابا جوگندر ناتھ ایک دم فسٹ کلاس آدمی ہے۔سالا میرے کو بڑا ہوتا ہے۔''

یہ کہہ کر روی نے حویلی بوسیدہ گیٹ کے بائیں جانب موجود گھنٹی کا بٹن دبایا۔ایک لمحے کے بعد حویلی کا بوسیدہ گیٹ ایک ہولناک چرچراہٹ کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔دروازہ کھولنے والا ایک سادھو نما شخص تھا جس نے گیروے رنگ کا ایک گندا اور میلا کچیلا سا لباس پہن رکھا تھا۔ سرخ سرخ آنکھوں سے انگارے پھوٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ مائیکل نے اپنی پوری زندگی میں کبھی بھی اتنا غلیظ اور پراسرار شخص نہیں دیکھا تھا۔اسے ابکائی آتے آتے رک گئی۔وہ ایک ٹک اس شخص کی طرف دیکھے جا رہے تھا البتہ روی بڑے اعتماد سے بولا۔'' کیا بابا جوگندر ناتھ گھر میں موجود ہے؟'' سادھو نے جواب دینے کی بجائے اثبات میں سر ہلا دیا۔

روی دوبارہ بولا۔'' تو جاؤ بابا جوگندر ناتھ سے بولو کہ روی ملاقات کے واسطے آیا ہے'' سادھو الٹے قدموں واپس ہوگیا اور وہ دونوں گیٹ پر رک کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ مائیکل بغور حویلی کا جائزہ لے رہا تھا باہر کی نسبت یہ حویلی اندر سے اور زیادہ ویران اور پراسرار نظر آ رہی تھی۔ ہر طرف جھاڑ جھنکار اور بے ترتیب جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ حویلی کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ وسیع برآمدے کے شکستہ ستون بمشکل چھت کو سنبھالے ہوئے تھے اور تقریباً ہر کمرے کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ اگر کوئی شیشہ سلامت بھی تھا تو وہ مکڑی کے جالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

حویلی کی حالت دیکھ کر بے اختیار مائیکل ایک جھرجھری لے کر رہ گیا۔ تاہم روی سے اس نے کچھ بھی پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ روی اس کی اندرونی کیفیت سے لاتعلق ہو کر سادھو کی واپسی کا منتظر تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد سادھو واپس لوٹا اور ان دونوں کو ساتھ لے کر حویلی کے شکستہ برآمدے کی طرف بڑھ گیا۔وہ دونوں بڑی خاموشی کے ساتھ سادھو کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ سادھو نے ابھی تک اپنی زبان کو جنبش تک نہیں دی تھی اور یہی بات مائیکل کو کھٹک رہی تھی۔ سادھو اسے اس دنیا کا انسان ہی نظر آ رہا تھا اس پر کسی روح کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ اپنی زبان

سے کوئی الٹی سیدھی بات نکال کر اپنے لیے کوئی مصیبت کھڑی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چند لمحوں کے بعد سادھو انہیں ایک بڑے سے کمرے کے سامنے چھوڑنے کے بعد واپس لوٹ گیا۔

سادھو کے جانے کے بعد روی نے آہستہ سے کمرے کے دروازے کو دھکیلا تو وہ ایک ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ روی کمرے کے اندر قدم رکھتے ہوئے بولا" جوگندر بابا اپن روی ہے۔ اپن کے ساتھ ایک دوست بھی ہے کیا ہم دونوں اندر آسکتے ہیں؟"

"آجاؤ آجاؤ۔" اندر سے ایک سرد سی آواز آئی تو وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہوگئے۔ کمرے میں ایک ہلکی سی نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی اور عین کمرے کے وسط میں ایک مکروہ صورت نوکیلے دانتوں والا غلیظ سا ادھیڑ عمر شخص بیٹھا۔ جس کے بدن پر صرف ایک گندی سی میلی کچیلی دھوتی بندھی ہوئی تھی وہ آلتی پالتی مارے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ کمرے کی شکستہ دیواروں پر عجیب وغریب ڈراؤنی قسم کی تصویریں آویزاں تھیں۔ ان تصویروں نے کمرے کی ہولناکی میں حد درجہ اضافہ کر رکھا تھا۔ ایک کونے میں چند انسانی کھوپڑیاں بکھری ہوئی تھی۔ ایک طرف قدیم زمانے کی طشتریاں، لیمپ اور اس طرح کی دوسری الم غلم چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔

کمرے میں ایک نامعلوم قسم کی بو پھیلی ہوئی تھی جسے وہ دونوں کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھے۔ جوگندر ناتھ کے نزدیک پہنچنے کے بعد روی نے مائیکل کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس کے ساتھ کمرے کے پختہ فرش پر بیٹھ گیا جوگندر بابا بدستور آنکھیں بند کیے بڑبڑانے میں مصروف تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنی انگارہ نما آنکھیں کھولیں اور غور سے ان دونوں کا جائزہ لینے کے بعد بولا۔" بالک، اپنا مقصد بیان کرو کیا چاہتے ہو؟"۔

روی نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔" جوگندر بابا یہ مائیکل ہے اپن کا دوست۔ اپن اس کو تمہاری خدمت میں اس واسطے لایا ہے کہ یہ سالا ایک بہت بڑے لفڑے میں پھنس گیا ہے۔

جوگندر بابا روی کی بات سن کر مائیکل کی طرف متوجہ ہوگیا۔" بول بالک۔ تو کس قسم کا سمیا (مسئلہ) میں پھنس گیا ہے؟"

مائیکل جو پہلے ہی کمرے کا پراسرار ماحول دیکھ کر خوفزدہ بیٹھا ہوا تھا اس کا سوال سن کر بوکھلا اٹھا۔" وہ۔ وہ کیا ہے کہ۔ میں شہریار احمد سے؟"

"بالک ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تم کھل کر اپنی بات بیان کرو۔ میں ضرور تمہاری پریشانی کا کوئی نہ کوئی اپائے تلاش کرلوں گا۔" جوگندر بابا اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

جوگندر بابا نے جب مائیکل کی ڈھارس بندھائی تو اس نے بلا تامل اپنی ساری رام کتھا اسے سنا ڈالی۔ مائیکل کی کہانی سن کو جوگندر بابا ایک بار پھر اپنی آنکھیں بند کر کے مراقبے میں چلا گیا۔ مائیکل اور روی خاموشی کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہے تھے مگر وہ ان دونوں کی موجودگی سے بے خبر زیر لب کچھ بڑبڑاتا جا رہا تھا۔

اچانک کمرے کے روشندان سے ایک کثیف دھواں کمرے میں بھرنا شروع ہوگیا اور پھر ایک لمحہ کے بعد یہ دھواں ایک خوفناک انسانی روپ دھار چکا تھا۔ یہ محیر العقل منظر دیکھ کر ڈر کے مارے مائیکل کسی خزاں رسیدہ پتے کی مانند لرزنے لگا اگر روی اس کے ساتھ نہ ہوتا تو شاید اب تک وہ بے ہوش ہوچکا ہوتا۔ کثیف دھواں انسانی شکل اختیار کرنے کے بعد آگے بڑھا اور مودب انداز میں جوگندر ناتھ سے بولا۔" کیا حکم ہے میرے آقا مجھے کس لیے طلب کیا گیا ہے۔؟"

جوگندر ناتھ نے آنکھیں کھولیں اور ایک مکروہ مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بولا۔ لکام! تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ آقا ابلیس نے تجھے میری خدمت پر مامور کر رکھا ہے اور یہ میری تپسیا کا صلہ ہے کیونکہ میں آقا ابلیس کا ایک بہترین کارندہ ہوں۔ آج میں نے تجھے کسی خاص مقصد کے لیے بلایا ہے۔"

"میں حاضر ہوں آقا حکم فرمایئے۔" لکام نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

"لکام تجھے ایک مسلمان نوجوان باکسنگ کا مقابلہ کرنا پڑے گا اور سن تجھے ہر صورت میں یہ مقابلہ جیتنا ہے ورنہ میں تجھے جلا کر راکھ کردوں گا سمجھ گئے نا؟"

"بالکل سمجھ گیا ہوں آقا آپ کو چنتا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں اس مسلمان نوجوان کو چیونٹی کی طرح مسل دوں گا۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک۔" اتنا کہہ کر جوگندر ناتھ ایک بار پھر مائیکل کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"بالک! اس کام کی فیس بیس ہزار روپے ہوگی بولو منظور ہے؟"

"منظور ہے جوگندر بابا لیکن مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آئی کہ یہ لکام میری جگہ شہر یار سے باکسنگ کا مقابلہ کیسے کرے گا؟" مائیکل نے الجھے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

''مورکھ، یہ لکام ہے میرا ایک بیر۔ یہ ہر شخص کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔''

''بیر کیا ہوتا ہے؟ جوگندر بابا۔'' مائیکل نے دوبارہ سوال کیا۔

''مورکھ! یہ تمہاری دنیا کا انسان نہیں ہے ایک جن زادہ ہے تمہاری شکل اختیار کر کے یہ تمہارے حریف سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ کہو تو یہ ابھی تمہاری صورت دھار لے۔''

مائیکل نے جواب دینے کی بجائے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جوگندر ناتھ نے مائیکل کا مقصد بھانپتے ہوئے لکام کو اشارہ کیا تو وہ دوبارہ دھوئیں میں تبدیل ہو گیا۔ ایک ثانیہ بعد جب وہ انسانی شکل میں آیا تو مائیکل اسے دیکھ کر بوکھلا کر گر گیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہا ہو۔ روی بھی متحیر ہو کر یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

مائیکل نے لکام کو اپنے حلیے میں دیکھ کر پرمسرت انداز میں اپنی جیب سے پھولا ہوا پرس نکالا اور ہزار ہزار کے بیس نوٹ گن کر گوندر ناتھ کی طرف بڑھا دیئے۔

جوگندر ناتھ نے نوٹ پکڑتے ہوئے کہا۔'' بالکل۔ تجھے ابھی پوری طرح میری شکتیوں کے بارے میں معلوم ہی نہیں ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ شہر یار تجھے آج تک کس کے بل بوتے پر شکست دیتا آ رہا ہے''۔

مائیکل نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''تو سن مورکھ! شہر یار کی پشت پر اس شہر کی مشہور ہستی حشمت علی شاہ ہے۔ اس کی دعاؤں کے طفیل شہر یار آج تک جیتتا آ رہا ہے۔ شاید تم نے کبھی غور نہیں کیا ہوگا کہ شہر یار کے دائیں بازو پر ایک تعویذ ہر وقت موجود رہتا ہے جو اسے حشمت شاہ نے ہی دیا ہے۔ یہی تعویذ اور حشمت علی شاہ کی دعائیں ہی شہر یار کی فتح کی اصل وجوہات ہیں لیکن ایک بار جب شہر یار کا مقابلہ لکام سے ہوگا تو اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیگا۔ اب یہ مقابلہ تمہارے اور شہر یار کا نہیں بلکہ جوگندر ناتھ اور حشمت شاہ کے درمیان ہوگا۔ میں نے اس سے بہت پرانا حساب چکانا ہے۔'' جوگندر ناتھ نے ان دونوں کے سامنے تفصیل بیان کرتے ہوئے جواب دیا۔

مائیکل نے جوگندر ناتھ کا شکریہ ادا کیا اور اجازت لے کر روی کے ساتھ پراسرار حویلی سے باہر نکل آیا جہاں اس کی گاڑی ایک طرف کھڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

ایک ہفتے کے بعد مائیکل جانسن نے ایک بار پھر شہر یار احمد کو چیلنج کر دیا تھا۔ پورے

ممبئی شہر میں مقابلے کی پبلسٹی کرنے کے لیے دیواروں پر بڑے بڑے پوسٹر چسپاں کر دیئے گئے تھے۔ مقابلے کی تاریخ پندرہ دن بعد کی رکھی گئی تھی۔

مقابلے سے چند روز قبل حشمت علی شاہ صاحب نے شہر یار کو اپنے آستانے پر بلوایا اور شفقت آمیز لہجے میں بولا۔'' بیٹے! مقابلے کی تیاری کر رہے ہو ناں؟''

''بالکل کر رہا ہوں شاہ صاحب آپ بے فکر رہیے۔''

شاہ صاحب نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور پھر پریشان کن انداز میں کہا۔'' بیٹے۔ مجھے اس بار دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔ مائیکل کا اچانک تمہیں چیلنج کرنا کوئی گہری چال بھی ہو سکتی ہے اس لیے تم ہوشیار رہنا۔''

''شاہ صاحب۔ آپ بلاوجہ پریشان ہو رہے ہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

''شہر یار! دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا ورنہ کسی دن بے موت مارے جاؤ گے اور میری نصیحت تو یاد ہے ناں؟''

''بالکل شاہ صاحب میں آپ کی نصیحت کبھی نہیں بھول سکتا۔'' اتنا کہہ کر شہر یار نے دائیں ہاتھ کی آستین اوپر چڑھائی تو اس کے بازو پر بندھا ہوا تعویذ صاف نظر آنے لگا۔

شاہ صاحب نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا'' مجھے تم پر فخر ہے بیٹے لیکن میری ایک بات یاد رکھنا۔ اس تعویذ کو کبھی بھی اپنی بازو سے جدا نہ کرنا ورنہ تم مشکل میں پھنس سکتے ہو۔ اس تعویذ میں اللہ تعالیٰ کا پاک کلام ہے۔

''میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا شاہ صاحب۔''

''جیتے رہو بیٹا اب تم جا سکتے ہو اپنے ابا جان سے میرا اسلام عرض کر دینا۔''

شہر یار نے اثبات میں سر ہلایا اور شاہ صاحب سے مصافحہ کرنے کے بعد آستانے سے باہر نکل آیا۔ شاہ صاحب کے آستانے پر وہ ہمیشہ پیدل ہی حاضری دیا کرتا تھا ورنہ اس کے استعمال میں ہر وقت ایک نئی کار رہتی تھی۔

شاہ صاحب کے آستانے سے نکلنے کے بعد وہ اپنی ہی دھن میں چلتے چلتے مین روڈ پر پہنچ گیا۔ اس وقت اس کا ذہن مختلف خیالات کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مائیکل کا اچانک اسے چیلنج کرنا شاہ صاحب کی نامعلوم پریشانی اور تعویذ کے متعلق تاکید یہ سب باتیں اسے کچھ عجیب سی لگ رہی تھیں۔

اپنے خیالات سے وہ اس وقت چونکا جب اچانک ایک گاڑی چرچراہٹ کی آواز پیدا کرتے ہوئے اس کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ گاڑی میں اس کا حریف مائیکل اپنے دوست کے ساتھ بیٹھا تحقیر آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شہر یار نے ایک اچٹتی سی نظر ان پر ڈالی اور بغیر کچھ کہے قدم آگے بڑھا دیئے۔ مائیکل نے تیزی سے گاڑی کی کھڑکی کھولی اور پھر اس کے پیچھے لپکا'' سنو شہر یار۔'' اس نے عقب سے آواز لگائی۔

''کیا بات ہے؟'' شہر یار چلتے چلتے رک گیا۔

'' مجھے ایک مسلمان سے ایسی چیٹنگ کی امید نہیں تھی۔'' مائیکل اس کے قریب پہنچ کر بولا۔

''کیسی چیٹنگ؟'' اس نے نرم لہجے میں سوال کیا۔

''یہی کہ تم آج تک مجھ سے حشمت علی شاہ کے بل پر جیتتے آ رہے ہو۔ اب بھی یقیناً تم اسی کے آستانے سے ہو کر آ رہے ہو؟''

مائیکل کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے تو شہر یار کا خون کھول اٹھا اور اس کا دل چاہنے لگا کہ ابھی اس کے جبڑے پر ایک مکا جڑ دے مگر پھر بڑی مشکل سے اپنا غصہ کنٹرول کرتے ہوئے بولا۔'' مائیکل! شاید مسلسل شکستوں نے تمہیں باؤلا کر دیا ورنہ تم کبھی بھی ایسی بے تکی بات نہ کرتے۔ شاہ صاحب سے ہمارے گھریلو تعلقات ہیں۔ ہمارا سارا گھرانہ ان کا معتقد ہے تم بلاوجہ مجھے الزام دے رہے ہو۔''

مائیکل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔'' اگر میں یہ بات سچ ثابت کر دکھاؤں تو پھر کیا کہو گے؟''

'' جو تم چاہو گے وہی کروں گا''

'' پرامز کرتے ہو؟''

'' بالکل پکا پرامز۔'' وہ بلا تردد بولا۔

'' ٹھیک ہے تو پھر ایسا کرو فی الحال تو یہ تعویذ تم میرے حوالے کر دو جو تمہارے دائیں بازو پر بندھا ہوا ہے''

کبھی کبھار سامنے والا کوئی ایسا سوال کر دیتا ہے جو سننے والے کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ بالکل یہی کچھ شہر یار کے ساتھ اتنی سرعت سے پیش آیا تھا کہ ایک لمحے کے لیے

تو سٹپٹا کر رہ گیا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہے تو کیا کہے۔ بدقت تمام وہ صرف اتنا کہہ سکا۔

''نہیں یہ ناممکن ہے۔''

'' تو پھر مان لو کہ تمہیں جتوانے میں اس تعویذ کا عمل دخل ہے۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟'' مائیکل کے لہجے میں اصرار تھا۔

''ہاں ہنڈرڈ پرسنٹ جھوٹ ہے۔''

''اگر یہ جھوٹ ہے تو پھر تم تعویذ میرے حوالے کیوں نہیں کرتے؟'' مائیکل کے انداز میں طنز تھا جسے شہر یار نے صاف طور پر محسوس کر لیا تاہم وہ تحمل سے کام لیتے ہوئے بولا۔'' دیکھو مائیکل تمہارے اور میرے درمیان ایک خاص فرق ہے اور وہ فرق ہے مذہب کا میں ایک مسلمان ہوں جب کہ تم غیر مسلم ہو۔ میں کبھی بھی یہ تعویذ تمہارے حوالے نہیں کروں گا کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کا وہ پاک کلام ہے جسے کوئی غیر مسلم چھو بھی نہیں سکتا سمجھے۔''

مائیکل نے اس کا جواب سن کر ثانیے کے لیے کچھ سوچا اور پھر کسی نتیجے پر پہنچ کر بولا'' ٹھیک ہے تمہاری توجیہہ مان لیتا ہوں، لیکن تمہیں بھی اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے میری ایک بات تسلیم کرنا پڑے گی''۔

''اگر قابل قبول ہو تو ضرور مانوں گا۔''

'' بالکل قابل قبول ہے۔ تمہیں صرف یہ کرنا ہوگا کہ آئندہ مقابلے میں اپنے بازو پر یہ تعویذ باندھ کر نہیں آؤ گے ورنہ میں اسے کھلی چیٹنگ ہی سمجھوں گا۔''

شہر یار عجیب کشمکش کا شکار ہو گیا تھا۔ مائیکل کا جواز بھی درست تھا اور شاہ صاحب کی نصیحت بھی بجا تھی کہ اس تعویذ کو کبھی بھی اپنے بازو سے الگ نہ کرنا۔ اب اگر وہ مائیکل کو انکار کرتا تو یہ اس کی اپنی سبکی تھی اور تعویذ اتار دیتا تو شاہ صاحب کی ناراضگی کا خدشہ تھا۔ بہرحال اس نے سارا معاملہ خدا پر چھوڑنے کے بعد مائیکل سے وعدہ کر لیا کہ وہ اس بار بغیر تعویذ کے باکسنگ میں اترے گا۔

مائیکل نے اس کا شکریہ ادا کیا اور مصافحہ کرنے کے بعد اپنی گاڑی کی طرف مڑ گیا۔ دل ہی دل میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا کیونکہ اب اسے پختہ یقین ہو گیا تھا کہ اس بار شہر یار کو ایک عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اسے معلوم تھا کہ لگام شہر یار کی بڑی پسلی ایک

کر دے گا۔

☆☆☆

ٹھیک پانچ روز بعد ایک بار پھر ممبئی کا وہی مشہور معروف ہال تماشائیوں سے پر تھا۔ اس بار تو انڈیا کے دوسرے شہروں سے بھی لوگ مقابلہ دیکھنے کی غرض سے آئے تھے۔ پورے ہال میں ایک بھی سیٹ خالی نہیں تھی چند ایک لوگ جنہیں سیٹ نہیں مل سکی تھی ہال کے کونوں کھدروں میں کھڑے ہوئے تھے۔

انتظامیہ نے سرتوڑ کوشش کی تھی کہ ہر شخص کو سیٹ مل جائے لیکن تماشائیوں کی تعداد ان کی توقع سے بھی بڑھ گئی تھی۔ مائیکل جانسن بھی بدلے ہوئے حلیے کے ساتھ ہال میں موجود تھا۔ اس کی سیٹ بالکل رنگ کے قریب تھی۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر روی بیٹھا ہوا تھا ان دونوں کے عین پیچھے دوسری رو میں حشمت علی شاہ صاحب اپنی سیٹ پر بیٹھا زیر لب کوئی ورد پڑھنے میں مصروف تھا۔ دونوں باکسرز ابھی تک رنگ میں تشریف نہیں لائے تھے تاہم جج صاحبان اور ریفری تشریف لا چکے تھے۔

اناؤنسر نے مائیک پکڑ کر کچھ دیر دونوں باکسرز کے بارے میں لیکچر دیا اور پھر لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گیا کیونکہ دونوں باکسرز رنگ میں تشریف لا چکے تھے۔ اناؤنسر نے ایک بار پھر ناظرین سے مخاطب ہو کر مقابلہ شروع ہونے کی اناؤنسمنٹ کی اور اسٹیج سے نیچے اتر گیا۔

دونوں باکسرز بیک وقت اوچھل کر رنگ میں کودے اور اپنے اپنے گاؤن اتارنے میں مصروف ہو گئے۔ حشمت علی شاہ کی نگاہیں شہر یار پر جمی ہوئی تھیں۔ گاؤن اتارنے کے بعد شہر یار نے معمول کے مطابق گاؤن لپیٹ کر حشمت علی شاہ کی طرف اچھال دیا۔

ریفری نے دونوں باکسرز کو رنگ کے درمیان بلایا اور ان کے گلوز چیک کرنے کے بعد مقابلہ شروع کرنے کا اشارہ کر دیا۔ دونوں باکسرز نے آپس میں ہاتھ ملایا تو شہر یار چونکے بنا نہ رہ سکا۔ مائیکل جانسن سے ہاتھ ملاتے وقت سردی کی ایک تیز لہر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی مگر اس نے اس بات پر کوئی توجہ نہ دی۔

پہلے راؤنڈ کی بیل بجی اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ بیل بجتے ہی لکام جو کہ مائیکل جانسن کے روپ میں تھا کسی وحشی درندے کی طرح شہر یار پر پل پڑا۔ اس کا ہر پنچ شہر یار کو کسی گیند کی طرح اچھال دیتا۔ جوابی کارروائی تو ایک طرف رہی شہر یار اپنا دفاع بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ اس بچارے کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس مرتبہ اس کا مقابلہ کوئی انسان نہیں بلکہ ایک جن زادہ کر رہا ہے۔

راؤنڈ ختم ہونے میں ابھی ایک منٹ باقی تھا جب شہر یار لکام کا ایک زبردست پنچ کھا کر لڑکھڑاتے ہوئے رنگ میں گر پڑا۔ ریفری نے اسے گرتے دیکھ کر انگلی اٹھا کر گنتی شروع کر دی۔ ''ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ سات'' قریب تھا کہ ریفری کی گنتی دس تک پہنچ جاتی اور شہر یار پہلے ہی راؤنڈ میں ناک آؤٹ ہو جائے لیکن ریفری کی گنتی پوری ہونے سے قبل ہی شہر یار بمشکل اٹھ کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا اور اسی اثناء میں پہلا راؤنڈ ختم ہو گیا۔

حشمت علی شاہ صاحب جو شہر یار کا دایاں بازو بغیر تعویذ کے دیکھ چکے تھے حد درجہ پریشان اور متفکر نظر آ رہے تھے۔ تاہم انہوں نے نہایت ہی سرعت کے ساتھ اپنی جیب سے ایک تہہ شدہ کاغذ کا ٹکڑا نکالا اور اسے کھول کر پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ اس کاغذ کے ٹکڑوں میں حروف ابجد میں کچھ درج تھا۔ شاہ صاحب نے جلدی سے ان حرف پر ایک سرسری نظر ڈالی اور کاغذ کے اس ٹکڑے کو دوبارہ اسی انداز میں تہہ کر دیا۔ اس کے بعد وہ بڑی پھرتی کے ساتھ اپنی سیٹ سے اٹھا اور رنگ کے قریب پہنچ گیا جہاں ایک کونے میں شہر یار تولیے سے منہ صاف کرنے کے بعد پانی پینے میں مصروف تھا۔ شاہ صاحب نے رنگ کے قریب پہنچتے ہی ایک ہاتھ سے شہر یار کا کندھا تھپتھپایا اور دوسرے ہاتھ سے پلک جھپکنے کی دیر میں کاغذ کا وہ تہہ شدہ ٹکڑا شہر یار کے دائیں گلوز میں گھسیڑ دیا۔ اس کام میں شاہ صاحب نے اتنی سرعت دکھائی تھی کہ تماشائی تو ایک طرف رہے۔ ریفری اور جج صاحبان بھی اسے چیک نہ کر سکے۔

شہر یار کے مدمقابل کو پہچاننے کے باوجود شاہ صاحب نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا تھا۔ وہ اگر چاہتے تو مقابلہ رکوا کر لکام کی اصلیت سب کے سامنے عیاں کر سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ وہ سارا معاملہ جان چکے تھے کہ اس سارے کام کے پیچھے جوگندر ناتھ کا ہاتھ ہے۔ وہ جوگندر ناتھ جو سفلی علوم کا ماہر ہونے کے باوجود کئی بار شاہ صاحب کے مدمقابل آ گیا تھا اور شاہ صاحب اسے سبق سکھانے کا بندوبست کر چکے تھے۔

دوسرے راؤنڈ کی بیل بج چکی تھی۔ پہلے راؤنڈ میں لکام جو کہ مائیکل کے روپ میں تھا بیس پوائنٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جب کہ شہر یار کو کوئی بھی پوائنٹ نہیں ملا تھا۔ دوسرے راؤنڈ میں حیرت انگیز طور پر شہر یار اپنے آپ کو بے حد چست محسوس کر رہا تھا۔ اب

اسے اپنا مد مقابل ایک کمزور سا شخص نظر آ رہا تھا۔

لکام نے پہلے راؤنڈ میں اندھا دھند شہر یار پر مکوں کی بارش کر دی تھی لیکن اب کی بار اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی سنگی مجسمے پر مکے برسا رہا ہو۔ شہر یار بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اس کا ہر حملہ روک رہا تھا۔ لکام نے جھنجھلا کر اس کی ناف کے نیچے پنچ لگانے کی کوشش کی مگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا کیونکہ شہر یار نے بڑی تیزی کے ساتھ بائیں ہاتھ سے اس کا پنچ روکا اور دائیں ہاتھ سے پوری قوت کے ساتھ اس کے چہرے پر ایک بھر پور مکا جڑ دیا۔ شہر یار کا یہ مکا اس قدر شدید تھا کہ لمحہ بھر کے لیے لکام کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ غیر ارادی طور پر لکام کے دونوں ہاتھ اپنے چہرے کی طرف اٹھے اور پھر یہی لمحہ اس کے لیے قیامت بن گیا۔ شہر یار کا دایاں بازو ایک بار پھر ہوا میں بلند ہوا اور کسی ہتھوڑے کی طرح لکام کے سینے پر پڑا اور وہ کسی بھیلیے کی طرح ڈکراتا ہوا رنگ کی رسیوں سے جا ٹکرایا۔

ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ شہر یار کا دوسرا مکا دوبارہ اس کے سینے پر پڑا۔ لکام کے منہ سے ایک کراہ سی نکلی اور وہ تقریباً دوہرا سا ہو گیا لیکن اب تو شہر یار پر ایک جنون سا سوار ہو گیا۔ اس کا دایاں ہاتھ کسی مشین کی طرح چل رہا تھا اور لکام پورے رنگ میں کسی فٹ بال کی طرح اچھل رہا تھا۔

اچانک ہال میں تڑاخ کی آواز گونجی اور لکام کسی کٹتے ہوئے درخت کی طرح دھڑام سے رنگ میں گر پڑا شاید اس بار شہر یار کے مکے نے اس کی پسلیاں توڑ دی تھیں۔ تماشائیوں نے پورا ہال سر پر اٹھا رکھا تھا اور دل کھول کر شہر یار کو داد دے رہے تھے۔

ریفری نے لکام کے گرتے ہی انگلی اٹھا کر گنتی شروع کر دی۔ ''ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ؟''

اس سے پہلے کہ ریفری کی گنتی آگے بڑھتی رنگ میں پڑا ہوا لکام کا وجود اچانک دھوئیں میں تبدیل ہوا اور پلک جھپکتے ہی غائب ہو گیا۔ ریفری سمیت ہال میں موجود تمام تماشائیوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کچھ خواتین کے منہ سے بے ساختہ چیخیں نکل گئیں۔ منظر ہی ایسا دہشت ناک تھا کہ تمام ہال کو سانپ سونگھ گیا۔ سب متحیر ہو کر رہ گئے تھے۔

اچانک حشمت علی شاہ نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے مائیکل جانسن کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا ''مائیکل جانسن۔ جوگندر ناتھ کے بیر کا انجام

دیکھ لیا ہے یا ابھی کوئی حسرت باقی رہ گئی ہے۔ احمق انسان کبھی کفر بھی جیتا ہے حق سے۔ یہ دھوکا بازی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی''۔

حشمت علی شاہ کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے مائیکل کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا پھر وہ خود پر قابو پا کر بولا۔ ''بزرگوار آپ کو شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے کیا میں آپ کو مائیکل جانسن نظر آ رہا ہوں؟''

شاہ صاحب نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ''کیا تم میری یہ غلط فہمی دور کرنے کے لیے اسٹیج تک چلو گے؟''

''نہیں مجھے کیا ضرورت ہے اسٹیج پر جانے کی۔

آپ بلاوجہ میرے گلے پڑ رہے ہیں۔'' مائیکل بدستور خود کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ شاہ صاحب اس کی بات کا کوئی جواب دیتے ایک اناؤنسر مائیک تھام کر بولا ''میں ہال میں موجود تمام لوگوں سے درخواست کروں گا کہ کوئی بھی شخص اپنی سیٹ سے نہ ہلے۔ کیونکہ معاملہ بہت گمبھیر صورت اختیار کر چکا ہے۔ ہمیں اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے مجبوراً آپ لوگوں کو روکنا پڑ رہا ہے۔''

جونہی اناؤنسر کی بات مکمل ہوئی شاہ صاحب اونچی آواز میں بولے۔ ''جناب۔ مجرم میں نے پکڑ رکھا ہے آپ لوگ فوراً اس کی گرفتاری کا بندوبست کریں۔''

مائیکل جانسن نے خود کو بچانے کے لیے آخری کوشش کرتے ہوئے ایک جھٹکے سے خود کو شاہ صاحب کی گرفت سے آزاد کرایا اور ہال کے مین گیٹ کی طرف دوڑ لگا دی۔ مگر ابھی وہ گیٹ سے چند قدم دور ہی تھا جب اچانک سیکورٹی پر موجود عملے کے دو نوجوانوں نے اسے پکڑ لیا۔ مائیکل نے خود کو چھڑانے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر اتنی دیر تک سیکورٹی گارڈ کے کافی نوجوان اس کے سر پر پہنچ گئے۔ اب اس کے لیے کوئی راہ فرار باقی نہیں رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد مائیکل جانسن اسٹیج پر پہنچ کر اپنے جرم کا اعتراف کر چکا تھا۔ اس نے بلا تمہید تمام کہانی ہال میں موجود لوگوں کو سنا دی تھی۔ مائیکل کا اعتراف جرم سننے کے بعد ہال میں موجود لوگ طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ ہر ایک اپنی اپنی ہانک رہا تھا مگر کوئی بھی اس بات کو جھٹلانے کی جرات نہ کر سکا کیونکہ وہ تمام یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔

دوسرے دن ہندوستان کے تقریباً تمام اخبارات نے یہ واقعہ جلی حروف میں تحریر کیا تھا۔ مائیکل جانسن کے ساتھ ساتھ جوگندر ناتھ کو بھی پولیس نے گرفتار کرلیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شہریار احمد کی بڑی بڑی تصاویر اور انٹرویو شائع کیا گیا تھا۔ اخبارات نے اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملادیئے تھے کیونکہ وہ دنیا کا پہلا باکسر تھا جس نے ہزاروں تماشائیوں کے سامنے ایک جن زادے کو شکست دے کر یہ ثابت کردیا تھا کہ انسان واقعی اشرف المخلوقات ہے۔ شہریار احمد نے اپنے انٹرویو میں اپنے پیرومرشد حشمت علی شاہ صاحب کا ذکر بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ کیا تھا۔



اجل کا روپ

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بدبخت کی کہانی کہاں سے شروع کروں؟ اس وقت سے جب ہم دونوں کم سن بچے تھے اور صرف شرٹ اور نیکر پہن کر قصبے کے اکلوتے پارک میں کرکٹ کھیلتے تھے یا پھر اس وقت سے شروع کروں جب ہم دونوں کالج میں ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے اور وہ بات بے بات ایک ہی جملہ کئی مرتبہ دہرایا کرتا تھا کہ ''انسان ایک معاشرتی جانور ہے''۔

یہ مشہور و معروف جملہ یوں سمجھئے کہ اس کا تکیہ کلام بن چکا تھا۔ لیکن مجھے اس جملے سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ میں کوئی دانشور یا تجزیہ نگار نہ تھا کہ اس جملے کی گہرائی پر غور کرتا اور اس میں پوشیدہ فلسفہ کھوج نکالتا۔ میں تو بس ایک عام سا سادہ لوح طالب علم تھا جس کی دنیا صرف نصابی کتب تک محدود تھی۔ دراصل اس جملے سے میرے چڑنے کی ایک خاص وجہ تھی۔ اس جملے میں انسان جیسی اشرف المخلوقات کو جانور کہا گیا تھا جسے میں کسی بھی قیمت پر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کیونکہ انسانی اعداد و شمار میں بڑے بڑے نبیوں، صحابیوں، ولیوں اور قطبوں کے نام آتے ہیں اور پھر ذرا اس پر بھی تو غور کیجئے کہ ہم لوگ روز مرہ کے معمولات میں نہ جانے کتنی مرتبہ لفظ ''جانور'' بطور گالی استعمال کرتے ہیں۔ یہ کوئی دانش مندی کی دلیل تو نہیں ہے کہ انسان کو جانور کہا جائے۔

ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ میں کوئی فلسفی یا سقراط ٹائپ قسم کا انسان نہیں تھا کہ وزنی دلائل کے ذریعے اس بدبخت کو قائل کرسکتا۔ وہ میرا دوست تھا اور یہ جملہ اس کا تکیہ کلام تھا جب کہ میری چڑ تھا۔ وہ ایک بڑے گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ دولت ان کے گھر کی باندی تھی۔ اس کے ایک اشارے پر نوکروں کی پوری فوج جمع ہوجایا کرتی تھی اور سونے پر سہاگہ یہ کہ وہ

اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اس لیے اس کی ہر جائز و ناجائز خواہش کو قابلِ احترام سمجھا جاتا تھا۔

''دولت اور طاقت'' یہ دونوں چیزیں مل کر کسی بھی انسان کو فرعون بنانے میں نہایت ہی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ دولت اور نخوت پسندی ابتدائی آفرینش سے لے کر آج تک لازم و ملزوم رہی ہیں۔ صدیوں پہلے مصر کے ایک فرعون کے پاس دولت اور طاقت اکٹھی ہوئی تو وہ اپنی قوم کے سامنے خدا بن بیٹھا تھا۔ اس فرعون کا عبرتناک انجام تو کلام پاک جیسی معتبر کتاب میں قیامت تک کے لیے محفوظ ہو کر رہ گیا ہے لیکن اس فرعون کا انجام جس کی کہانی میں آپ کو سنا رہا ہوں۔ انشاء اللہ زیرِ نظر کتاب کے صفحات میں موجودہ نسل کے لیے عبرت کا نشان بن کر رہ جائے گا''۔

اس کا پورا نام کاشف جمیل تھا لیکن وہ کاشی کہلوانا پسند کرتا تھا۔ اس کا باپ محمد جمیل احمد اپنے علاقے کا امیر ترین شخص تھا۔ وسیع و عریض جاگیر کے علاوہ ایک کی بجائے تین تین فیکٹریوں کا بلاشرکت غیرے مالک تھا۔

دولت کی اس ریل پیل نے کاشف جمیل کو بھی فرعون بنا دیا تھا۔ مذہب کو وہ محض ایک غیر ضروری پابندی سمجھتا تھا۔ وہ بارہا اس قسم کی باتیں کر جاتا تھا کہ مجھے اس پر دہریہ ہونے کا شک گزرنے لگتا تھا لیکن میں اسے کبھی نہیں ٹوکتا تھا۔ البتہ جب اس کا موڈ بنتا تھا تو مجھے تنگ کرنے کے لیے وہی مشہور جملہ دہرا دیتا تھا جو میری چڑ تھی۔ Human Being is Social animal باتیں بنانے کا وہ ویسے بھی ماہر تھا۔ الٹ پھیر کر کے کسی نہ کسی طرح باتوں کے بیچ اس جملے کو لے آتا تھا اور پھر خوب دل لگا کر میری تقریر سنتا رہتا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد ہمارا تعلیمی سلسلہ ختم ہو گیا اور میں غمِ روزگار میں الجھ کر رہ گیا۔ جب کہ وہ ان جھمیلوں سے آزاد تھا اس لیے دن رات سیر سپاٹے اور من مانیاں کرتا رہتا تھا۔ اب ہماری ملاقات کبھی کبھار ہی ہوا کرتی تھی اور وہ بھی ''ہائے ہیلو'' تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

تقریباً ایک سال قبل وہ اچانک ہی میرے غریب خانے پر آ دھمکا میں نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور اسے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد امی سے چائے کا کہہ دیا۔

''سجاد! تم سفلی علوم کے متعلق کیا جانتے ہو؟''

باتوں ہی باتوں میں اچانک اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

میں نے لمحہ بھر کے لیے غور سے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ بالکل سنجیدہ تھا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کی شرارت کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ تب میں نے گلا کھنکار کر کہا ''سفلی علوم کے کافرانہ دھندے میں ملوث لوگ بہت سے کاموں میں اللہ تعالیٰ کے پاک کلام کو گندگی اور ناپاک چیزوں پر لکھتے ہیں۔ کبھی قل ہو اللہ احد کے حروف کو پلٹ دیتے ہیں۔ کبھی اللہ کے دیگر کلام کو خون اور اس طرح کی دوسری گندی چیزوں سے تحریر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بہت سی چیزیں جن سے شیطان خوش ہوتا ہے لکھتے ہیں، یا پڑھتے ہیں۔ جب وہ شیطان کے مرضی کے مطابق کچھ لکھتے ہیں یا پڑھتے ہیں تو شیطان بہت سے غلط کاموں میں ان کی مدد کرتا ہے۔ کبھی کسی کنوئیں کا پانی عامل کی مرضی کے مطابق گہرائی میں کر دیتا ہے کبھی ان کو ہوا میں اڑا کر کسی دوسری جگہ پہنچا دیتا ہے اور کبھی کسی کا مال چرا کر ان کے پاس لے آتا ہے۔ اس طرح کے دیگر کاموں میں جن اور شیاطین عامل کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ دورِ اسلام میں جس نے اس کی داغ بیل ڈالی تھی۔ وہ ابونصر احمد بن ہلال البکیل تھا۔ یہ شخص جنوں سے کام اور خدمت لیا کرتا تھا اور ان سے ہم کلام بھی ہوتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے پاس تعجب خیز چیزیں اور آزمودہ عملیات تھے۔''

''میں کسی صورت میں بھی تمہاری اس بکواس پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں نے تو محض وقت گزاری کے لیے سوال کیا تھا۔ خدا کی پناہ اکیسویں صدی شروع ہو چکی ہے اور یہ حضرات ابھی تک جن بھوتوں اور سفلی علوم کے چکروں میں پڑے ہوئے ہیں۔ دنیا چاند کے بعد مریخ کو تسخیر کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہے اور ہماری یہ حالت ہے کہ ہم ابھی تک جنوں کے قصے الاپ رہے ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے؟'' وہ ایک دم میری گفتگو سن کر جھنجھلا اٹھا۔

کمرے کا ماحول ایک لمحے میں کشیدہ ہو گیا اور میں دل مسوس کر رہ گیا۔ وہ میرے بچپن کا دوست تھا اور اپنی تمام تر برائیوں کے ساتھ مجھے عزیز تھا۔ اگرچہ وہ پوری طرح مغربی تہذیبوں کے رنگوں میں رنگ چکا تھا لیکن میں پھر بھی اسے دین سے دور ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں نے اس کی بات سن کر غور سے اس کی طرف دیکھا اور قدرے نرم لہجے میں بولا۔ ''کاشف۔ یہ کائنات جو دن کے وقت اتنی جاذبِ نظر اور پُررونق نظر آتی ہے۔ یہ رات

کے وقت پراسرار کیوں لگنے لگتی ہے۔ دن کے وقت دنیا کا بزدل ترین شخص بھی نہیں ڈرتا لیکن رات کی تنہائی اور سناٹا بڑے بڑے بہادروں کو خوفزدہ کر دیتا ہے۔ آخر کیوں؟ اس سوال کا جواب ہے تمہارے پاس؟''

''ہاں ہے۔'' وہ بھڑک کر بولا۔

''ارشاد ارشاد۔'' میں نے طنزاً کہا۔

اس نے ایک ثانیے کے لیے سوچا اور پھر بڑے فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''انسان نفسیاتی طور پر اندھیرے سے خائف رہتا ہے۔ اس لیے تاریکی میں ایک بلی سے بھی خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس دن کے اجالے میں وہ خوفناک ترین چیز دیکھ کر بھی نہیں ڈرتا۔ رات اور دن کے درمیان صرف تاریکی کا فرق ہے سمجھے۔'' اس کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی۔

''لیکن یہ میرے سوال کا جواب نہیں میرے دوست۔ انسان آخر نفسیاتی طور پر صرف تاریکی سے کیوں ڈرتا ہے۔ اجالے سے کیوں نہیں ڈرتا؟ سوچو رات کی تاریکی اور پراسراریت میں ضرور کوئی راز پنہاں ہے۔ ورنہ حضور ﷺ نے کبھی یہ نہ فرمایا ہوتا کہ جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو سارے شیاطین پھیل جاتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ایسے وقت میں بچوں کو گھر سے باہر نکلنے سے روکنے کا حکم دیا ہے۔''

''ایک تو میں تمہاری اس عادات سے بڑا تنگ ہوں کہ تم ہر بات میں کوئی نہ کوئی دینی اور مذہبی دلیل پیش کر دیتے ہو۔ آخر مولانا جو ٹھہرے۔'' اس نے میری داڑھی کی طرف طنزیہ انداز میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''یوں کیوں نہیں کہتے کہ تم نے اپنی شکست تسلیم کر لی ہے۔''

''شکست تسلیم کرتی ہے میری جوتی میں صرف تمہاری بک بک سے تنگ آ گیا ہوں۔ تم صرف کتابی باتیں سنانے کے ماہر ہو۔ جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ یہ صرف چالاک اور عیار انسانوں کے من گھڑت قصے ہیں جو انہوں نے کمزور دل اور ناقص العقل انسانوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے گھڑے ہیں۔''

وہ کسی طرح بھی میری بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے تھک کر قریبی میز پر پڑے ہوئے جگ سے پانی لیا اور پینے کے بعد خالی گلاس دوبارہ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ

من گھڑت قصے نہیں ہیں کاشف تحسیل صاحب! بلکہ ناقابل تردید حقائق ہیں جن سے روگردانی کر کے تم گناہ کے مرتکب ہو رہے ہو۔ مجھے تو تمہارا ایمان خطرے میں پڑتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ اچھا چلو یہ بتاؤ کہ کیا تم جنات کو برحق مانتے ہو؟''

''بالکل بلاشک و شبہ مانتا ہوں کیونکہ قرآن پاک میں جنات کا تذکرہ موجود ہے اور بحیثیت مسلمان میں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔''

''شکر ہے تم نے اپنے آپ کو مسلمان تو مانا۔'' میں مسکراتے ہوئے بولا اور لمحہ بھر کے لیے اس کے چہرے کا رنگ بھی متغیر ہو گیا۔ ''ویسے تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے کہ جنات مختلف روپ دھار سکتے ہیں؟'' میں نے اسے شرمندگی سے بچانے کے لیے فوراً دوسرا سوال کر دیا۔

''اس بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا میں نے اس کی لاعلمی پر کف افسوس ملتے ہوئے ترحم آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر کچھ سوچ کر بولا۔

''سفلی علوم کے متعلق میرے خیالات سے تو تم آگاہ ہو چکے ہو لیکن اس علم کے متعلق تم نے اپنے خیالات کا کوئی بھی اظہار نہیں کیا؟''

''بالکل بکواس ہے۔ سادہ لوح لوگوں کو لوٹنے کا ایک بہترین اور آسان ذریعہ ہے۔ اس جدید سائنسی اور کمپیوٹرائز دور میں سفلی علوم کے ماننے والے پرلے درجے کے احمق کہلانے کے مستحق ہیں۔'' اس نے غصیلے انداز میں جواب دیا۔

''نہیں کاشف تم دوبارہ غلطی کر رہے ہو۔ سفلی علوم دنیا میں موجود ہے اور اس کے حامل جنات اور انسانوں میں سے ہیں جو ایسے ایسے مافوق الفطرت مناظر دکھاتے ہیں کہ ایک عام انسان چکرا کر رہ جاتا ہے۔ دنیا میں ازل سے نیکی اور بدی کی یہ جنگ جاری ہے اور حشر تک جاری رہے گی۔''

''میں نہیں مانتا کسی سفلی علوم کو۔'' اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

''چلو میں مان لیتا ہوں کہ تمہاری بات درست ہے لیکن تم خدا تعالیٰ کی ان برگزیدہ ہستیوں کے متعلق کیا کہو گے؟ جن کے معجزات پڑھ کر آج بھی انسان ورطہ حیرت میں پڑ جاتا ہے۔

"میں نے آج تک اپنی آنکھوں سے کوئی معجزہ رونما ہوتے نہیں دیکھا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ محض کتابی باتیں ہوں۔ اگر معجزات کو مان بھی لیا جائے تو بھی ان کا تعلق روحانی دنیا کے ساتھ ہے نا کہ سفلی دنیا کے۔

"بالکل بجا فرمایا ہے تم نے کہ معجزات کا تعلق روحانی دنیا کے ساتھ ہے لیکن تم ایک بات بھول رہے ہو دنیا میں ہر عمل ہر کام اور ہر چیز کی ایک ضد بھی موجود ہے۔ ضد یعنی الٹ جس طرح نیکی کا الٹ بدی ہے۔ محبت کا الٹ نفرت ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سے عوامل ہیں اور دنیا میں جو مثبت بھی ہوتے ہیں اور منفی بھی۔ میں تمہیں ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں کہ اگر ایک مومن اللہ تعالیٰ سے لو لگا کر، عبادت و ریاضت کے کڑے مراحل سے گزر کر مافوق الفطرت صلاحیتیں حاصل کرسکتا ہے تو کیا ایک بدکار انسان یا جن شیطان کی پیروی کر کے اور اسے اپنا آقا مان کر سفلی عوامل کے ذریعے نیک لوگوں کو صراط مستقیم سے بھٹکانے کے لیے طاغوتی طاقتیں حاصل نہیں کرسکتا؟ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟" میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہاری یہ فلسفیانہ گفتگو میری سمجھ سے باہر ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ تم مجھے میری حال پر چھوڑ دو۔ میں تمہاری کسی دلیل سے قائل ہونے والا نہیں ہوں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تمام جاندار مرنے کے بعد مٹی میں گل سڑ کر نئے اگنے والے پودوں کے لیے کھاد کا کام دیتے ہیں۔ یہ نیکی، بدی، روحانی شیطانی تمام عوامل صرف اسی کائنات تک محدود ہیں۔ میری سمجھ میں تو آج تک جنت ودوزخ کا فلسفہ بھی نہیں آیا اور تم روحانی اور شیطانی قصے لے کر بیٹھے ہو۔ ڈونٹ بی سلی یار لائف انجوائے کرو۔ یہ تم کن چکروں میں پڑ گئے ہو؟" میں نے مضحکہ خیز انداز میں کہا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"بھاگنے کی سوچ رہے ہو؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"نہیں یار! ایک ضروری کام یاد آگیا ہے پھر ملیں گے کسی دن بشرط زندگی۔" اس نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا اور میں اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

اس ملاقات کے چند روز بعد ایک دن مجھے اس کا پیغام ملا کہ اگر فرصت ہے تو میری طرف آجاؤ۔ شکار کھیلیں گے۔ آؤٹنگ کے ساتھ ساتھ تھوڑا ایڈونچر بھی ہوجائے گا۔

خوش قسمتی سے ان دونوں مجھے بالکل فراغت ہی تھی اور گھر میں پڑے پڑے مجھے

اکتاہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے اس کے پیغام کو ایک سنہری موقع سمجھا اور رخت سفر باندھ کر جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ امی سے اجازت لینے کا مرحلہ آیا تو انہوں نے تھوڑی سی پس وپیش کے بعد جانے کی اجازت دے دی۔

کاشف کے گھر تک پہنچنے کے لیے تو مجھے بہت کم وقت لگا تھا۔ لیکن وہاں کافی ٹائم تیاریوں میں صرف ہوگیا۔ کاشف کی حویلی میں ارشد اور یاسر بھی موجود تھے۔ وہ دونوں بھی ہمارے کالج کے زمانے کے دوست تھے۔ میرے ساتھ تو ارشد اور یاسر کی ملاقات کبھی کبھار ہوا کرتی تھی لیکن کاشف کے ساتھ ان دونوں کی گاڑھی چھنتی کیونکہ وہ بھی کاشف کی طرح امیر کبیر فیملیز سے تعلق رکھتے تھے۔

ارشد اور یاسر سے علیک سلیک کرنے کے بعد میں وہیں حویلی کے لان میں ان کے ساتھ ایک خالی کرسی پر براجمان ہوگیا۔ کاشف شاید شکار کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ تبھی وہ دونوں لان میں بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد ایک ملازم چائے کے ساتھ کافی لوازمات لے کر پہنچ گیا۔

"جناب! چھوٹے صاحب کہہ رہے ہیں کہ آپ لوگ اطمینان سے چائے وغیرہ پیجئے۔ اس کے بعد ہی شکار کے لیے روانہ ہوں گے۔" ملازم نے چائے کے لوازمات درمیانی ٹیبل پر سجاتے ہوئے مودب انداز میں کہا۔

"ارے تیرے چھوٹے صاحب کی ایسی کی تیسی۔ ہم ایک گھنٹے سے یہاں الوؤں کی مانند بیٹھے ایک دوسرے کو گھور رہے ہیں اور وہ لاٹ صاحب ابھی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ جاؤ اس سے کہو کہ جلدی کرے ہم نے کون سا شیر کے شکار کے لیے جانا ہے۔" یاسر بارعب لہجے میں بولا اور ملازم اثبات میں سر ہلاتے ہوئے واپس ہوگیا۔

"ہاں تو سجاد صاحب۔ آج کل آپ کیا کرتے پھر رہے ہیں؟ کبھی یاروں سے بھی مل لیا کرو۔ مانا کہ تم اب ایک برگزیدہ ہستی بننے جارہے ہو لیکن پھر بھی دوستوں کے لیے تو وقت نکالنا ہی پڑتا ہے۔" ارشد نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے مجھ سے شکایتی انداز میں کہا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔" وہ اپنے فیض صاحب نے کیا خوب کہا ہے کہ۔

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کردیا۔
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے"

شعر سن کر وہ دونوں بے اختیار مسکرا اٹھے۔ اور ہم نے گفتگو کا موضوع موجودہ ملکی
حالات کی طرف موڑ دیا۔ ایک لمحہ بعد وہ دونوں ملکی سیاست کے بخیے ادھیڑنے میں مصروف
تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ہم چاروں کاشف کی جیپ میں سوار ہو کر حویلی سے باہر نکل
رہے تھے۔ کاشف نے جیپ میں کھانے پینے کا کافی سامان رکھوا دیا تھا۔ سہ پہر کے تین بجے
ہم لوگ کاشف کی جاگیر پر پہنچے تو تھکان سے میرا برا حال تھا۔

ایک خوبصورت ریسٹ ہاؤس میں جا کر کاشف نے جیپ روک دی تو ملازم دوڑتے
ہوئے آئے اور کاشف کو سلام کرنے کے بعد ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ کاشف نے انہیں
جیپ سے سامان اتارنے کا حکم دیا اور پھر ہم تینوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''چلئے بھائی تھوڑی
دیر آرام وغیرہ کرتے ہیں پھر تازہ دم ہو کر شکار کا پروگرام بنائیں گے۔''

تھوڑی دیر کے بعد ہم چاروں ریسٹ ہاؤس کے ایک خوبصورت کمرے میں موجود
سفر کی تھکن اتار رہے تھے۔

تین دن تک ہم چاروں شکار سے محظوظ ہوتے رہے۔ اس دوران کوئی قابل ذکر
واقعہ پیش نہیں آیا۔ ریسٹ ہاؤس کے چاروں طرف دور دور تک کاشف کے باپ کی جاگیر پھیلی
ہوئی تھی۔ سرسبز و شاداب فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ پھلوں کے درخت وافر مقدار میں موجود تھے۔
ہم با آسانی جنگلی خرگوش اور فاختائیں وغیرہ شکار کر لیتے تھے۔ سات دن روسٹ پرندے اور
تازہ پھل کھا کھا کر ہماری طبیعت سیر ہو گئی تھی اور میں یہاں ایک قسم کی اکتاہٹ اور گھبراہٹ
محسوس کرنے لگا تھا البتہ وہ تینوں بے حد مسرور نظر آ رہے تھے۔ شکار کے ساتھ ساتھ وہ تینوں
رات کو پینے پلانے کا شغل بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔

کاشف نے کئی بار اپنے ساتھ مجھے بھی شامل ہونے کی دعوت دی تھی لیکن میں اسے
بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ٹال دیتا تھا۔ ایک رات تو حد ہو گئی جب ان تینوں نے زبردستی مجھے
پلانے کی کوشش کی تو میں ایک دم بھڑک اٹھا اور غصے کے عالم میں کاشف کو ایسی کھری کھری
سنائیں کہ اسے معافی مانگتے ہی بن پڑی۔ اس رات کے بعد انہوں نے کبھی بھی مجھے پینے کی
دعوت نہیں دی تھی البتہ ان کا اپنا شغل بلاناغہ جاری رہا۔

چوتھے روز صبح سویرے ہی میری طبیعت پژمردہ تھی دل تھا کہ رہ رہ کر کسی انجانے
خوف سے دھڑکا جا رہا تھا اور ریسٹ ہاؤس مجھے کسی زندان کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ ذہن میں

بار بار ایک ہی خیال آ رہا تھا کہ بس گھر پہنچ جاؤں۔ اپنی اس خواہش کا اظہار جب میں نے ان
تینوں کے سامنے کیا تو کاشف قہقہہ لگا کر بولا۔ ''رہے ناں مولانا کے مولانا۔ فطرت کے ان
رنگین و سنگین نظاروں سے لطف اندوز ہونے کی بجائے حضرت کو گھر کی یاد ستا رہی ہے۔ ارے
یار چلے جائیں گے ذرا لائف تو انجوائے کر لیں۔ گھر کون سا بھاگا جا رہا ہے۔''

''ہاں بھئی ہاں کاشف درست کہہ رہا ہے۔ اگر تمہاری طبیعت دشمناں تھوڑی بہت
اونچی نیچی ہے تو تم یہاں کمرے میں آرام کرو۔ ہم آج زیادہ دور نہیں جائیں گے بلکہ ریسٹ
ہاؤس کے ارد گرد ہی پرندوں کو شکار کرنے کی کوشش کریں گے۔'' ارشد نے کاشف کی تائید
کرتے ہوئے کہا اور یاسر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر وہ تینوں مجھے بولنے کا موقع دیئے بغیر مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے
اور میں تلملا تا رہ گیا۔ کافی دیر تک بستر پر لیٹا کمرے کی چھت کو گھورتا رہا۔ مطالعہ کرنے کی غرض
سے ایک کتاب ایک اپنے بیگ سے نکالی مگر پڑھنے میں بھی طبیعت نہیں لگ رہی تھی۔

ایک عجیب سی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ ریسٹ ہاؤس میں بھی خاموشی چھائی ہوئی
تھی۔ شاید کاشف نے باہر جانے سے پہلے ہی دونوں ملازموں کو کسی کام کے لیے بھیج دیا تھا۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا میری پریشانی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک انجانا سا خوف
تھا جو لمحہ بہ لمحہ مجھ پر حاوی ہوتا جا رہا تھا اور دل کسی آنے والے خطرے سے ہول رہا تھا۔ اس
سے قبل کبھی بھی مجھ پر ایسی کیفیت طاری نہیں ہوئی تھی۔ پورے ریسٹ ہاؤس میں موت کی سی
وحشت چھائی ہوئی تھی اور کمرے کی دیواروں سے سینکڑوں نادیدہ آنکھیں جھانکتی ہوئی محسوس
ہو رہی تھیں۔ موت کہیں ارد گرد ہی منڈلا رہی تھی۔ میرا پورا جسم پسینے میں شرابور ہوتا جا رہا تھا۔
قریب تھا کہ میں وحشت زدہ ہو کر چیخ اٹھتا۔

کہ اچانک کمرے کے باہر سے ان تینوں کی تیز تیز باتوں کی آواز آئی اور میں نہ
چاہتے ہوئے بستر سے اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

وہ تینوں برآمدے میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے تھے اور کاشف چلا چلا کر ایک ہی
بات دہرا رہا تھا۔ ''تم دونوں الو کے پٹھے ہو۔ وہ فاختہ میرے ہاتھ سے کبھی بچ نہ پاتی اگر تم
دونوں اکتا کر واپس نہ آتے۔ میرا نشانہ اتنا کچا نہیں ہے۔''

''بات کیا ہے؟ کیوں چلا رہے ہو کاشف؟'' میں نے ان کے نزدیک پہنچتے ہی سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''یار اسے سمجھا۔'' یاسر میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔'' ایک فاختہ پر اس نے تین بار گولی چلائی مگر وہ ہر بار بچ نکلی۔ شاید اس کا دانہ پانی ابھی باقی تھا لیکن یہ اسے اپنی انا کا مسئلہ بنائے بیٹھا ہے جیسے زندگی اور موت اللہ تعالیٰ نے اس کے ہاتھ میں دے رکھی ہو۔''

''وہ فاختہ اگر میری گولی کے نشانے پر آ جاتی تو تمہیں کبھی بھی ایسی بکواس کرن کی جرات نہیں ہوتی۔''

کاشف نے غصے سے بل کھا کر جواب دیا۔

''پلیز کاشف! خود کو کنٹرول کرو۔'' میں نے ملتجی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔'' میرے دوست! تم نے شاید وہ مشہور کہاوت ضرور ہی سنی ہو گی کہ مارنے والے سے بچانے والا طاقتور ہے۔''

''مولوی کی اولاد! بکواس مت کرو۔ وہ فاختہ ایک بار میرے ہاتھ میں دے دو پھر میں تجھے بتا دوں گا کہ مارنے والا طاقتور ہے یا بچانے والا۔''

''کفر مت بک! امیر باپ کے مغرور بیٹے! کان کھول کر میری ایک بات سن لے۔ جس خدا نے تجھے ایک شاندار محل میں پیدا کیا ہے وہ اگر چاہتا تو تجھے کسی فقیر کی کٹیا میں بھی پیدا کر سکتا تھا۔ اپنی دولت اور شان و شوکت پر اتنا اترا مت۔ تجھ سے پہلے بھی اس دھرتی پر کئی فرعون اور نمرود جنم لے چکے ہیں۔ ذرا ان کے عبرتناک انجام سے۔ اس سے پہلے کہ تجھ پر توبہ کے دروازے بند ہو جائیں ارض و سماء کے مالک سے گڑگڑا کر معافی مانگ لے۔ ورنہ پچھتانے کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔'' میں عالم طیش میں بولتا ہی چلا گیا۔ کاشف نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور پھر طنزیہ لہجے میں بولا۔'' دیکھو اس مولوی کو، مجھے توبہ کرنے کی تلقین فرما رہا ہے۔ ارے ابھی تو میرے کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔ توبہ کیسی، کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا ہے؟''

اس سے پہلے کہ میں غصے سے پاگل ہو کر کاشف کا گریبان سے پکڑ لیتا اچانک کاشف کے وہ دونوں ملازم ریسٹ ہاؤس کے بیرونی دروازے سے نمودار ہوئے اور تیز تیز چلتے ہوئے ہمارے نزدیک آ کر ٹھہر گئے۔ ان میں سے ایک نے اپنے ہاتھ میں ایک فاختہ پکڑ

رکھی تھی۔ فاختہ کو دیکھ کر کاشف کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہوئی اور پھر اس نے جھپٹ کر ملازم کے ہاتھ سے فاختہ چھین لی۔

''یہ دیکھ مولوی۔'' اس نے تمسخرانہ انداز میں فاختہ کو میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔'' اب بتا مارنے والا طاقتور ہے یا بچانے والا؟ سالے۔ دو ٹکے کا مولوی مجھے سبق پڑھانے چلا تھا۔''

''اگر خدا تعالیٰ کو اس فاختہ کی زندگی منظور ہے تو تیرے جیسے لاکھوں فرعون اور نمرود مل کر بھی اسے نہیں مار سکتے۔'' میں نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔

''لے پھر دیکھ لے مولوی۔ میں اس فاختہ کی گردن مروڑنے لگا ہوں۔ بچانے والے کو بلا سکتا ہے تو بلا لے بعد میں مجھ سے کوئی شکوہ مت کرنا کہ میں نے تجھے.....؟''

ابھی اس فرعون کا جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ ہم تینوں کے منہ سے بے ساختہ چیخیں نکل گئیں۔ فاختہ کے بجائے اس لعین کے ہاتھوں ایک خوفناک سیاہ رنگ کا ناگ لہرا رہا تھا۔ ارشد اور یاسر یہ خوفناک منظر دیکھ کر چلاتے ہوئے باہر کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے لیکن میں نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس لعین کا منہ فرط حیرت سے کھلا اور سیاہ رنگ ناگ نے یکے بعد دیگر تین بار اس کی زبان پر ڈسا اور پھر وہ اس کے ہاتھوں سے نکل کر پختہ فرش پر رینگنے لگا۔ یہ دیکھ کر دونوں ملازم بھی باہر کی طرف بھاگے۔ اس لعین کو چیخنے کی مہلت تک نہیں ملی تھی۔ وہ دھڑام سے فرش پر گرا اور پھر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ اس کا تمام جسم نیلا ہو چکا تھا اور منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ میں نے خوفزدہ انداز میں دوبارہ سیاہ ناگ کی طرف دیکھا اور حیرت ایک جھٹکا کھا کر رہ گیا۔ فرش پر ناگ کی بجائے ایک فاختہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا فاختہ اپنی جگہ سے اڑی اور دور نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں گم ہو گئی۔ اب میرے سامنے عصر حاضر کا فرعون عبرت کا نشان بنا پڑا تھا۔



آسیبی فلیٹ

برصغیر پاک و ہند کی تقسیم سے قبل عین وسط بازار میں ایستادہ پکی، شکستہ اور پراسرار حویلی کسی ہندو بنیے کی ملکیت تھی۔ ہندو طرز تعمیر ویسے بھی بڑا پیچیدہ اور بھول بھلیوں والا ہوتا ہے۔ مکان در مکان اس طرح بنے ہوتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کون سا دروازہ کون سے کمرے کا ہے۔

تقسیم کے بعد وہی حویلی حکومت پاکستان کی طرف سے ٹی اینڈ ٹی کے محکمے کی تحویل میں دے دی گئی مگر اس کے ساتھ ہی حویلی کے متعلق عجیب و غریب قسم کی چہ مگوئیاں شروع ہوگئیں۔ ہر دوسرا شخص اسے پراسرار اور آسیب زدہ ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ ویسے بھی ہندو اور پراسراریت صدیوں سے لازم و ملزوم چلے آ رہے ہیں۔ ایسے میں لوگوں کا اس پکی اور شکستہ حویلی کو پراسرار اور آسیب زدہ کہنا ایسی کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

محکمہ ٹی اینڈ ٹی کے عملے کے اکا دکا افراد کے ساتھ وقتاً فوقتاً پراسرار واقعات پیش آتے رہے لیکن وہ بچارے بھی مجبور تھے۔ اس حویلی سے نقل مکانی کر کے وہ کہیں بھی نہیں جا سکتے تھے۔ نوآموز حکومت کے پاس دوسری کوئی مناسب جگہ نہیں تھی جہاں محکمے کا عملہ رہائش پذیر ہو سکتا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے دشمن کے سینے پر مونگ دلتے ہوئے مملکت خداداد نے ترقی کی منازل طے کرنا شروع کر دیں اور محکمہ ٹی اینڈ ٹی کو رہائش کے لیے اپنی نئی عمارت مل گئی۔

خالی ہونے کے بعد وہ بوسیدہ اور پراسرار حویلی حصے بخروں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک بااثر خاندان نے اس کا بیشتر حصہ اپنے گھر میں شامل کر لیا کیونکہ اس بااثر خاندان کا گھر حویلی سے ملحق تھا۔ چند دوسرے تیز طرار قسم کے لوگوں نے اس حویلی کا تھوڑا بہت حصہ قبضے میں کر

کے اپنی اپنی دوکانیں بنالیں اور بقیہ ماندہ یہ حصہ جو کہ بدستور حکومت کی تحویل میں تھا وہ محکمہ تعلیم کے گرلز مڈل سکول کو ٹیچرز کی رہائش کے طور پر الاٹ کر دیا گیا۔ محکمہ تعلیم کی طرف سے اس حصے پر دو کمروں پر مشتمل ایک خوبصورت فلیٹ تعمیر کر دیا گیا لیکن کوئی بھی لیڈی ٹیچر اس فلیٹ میں رہائش رکھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ حویلی کا نام و نشان مٹ جانے کے بعد لوگ اب اس فلیٹ کو آسیب زدہ اور پراسرار کہنے لگ گئے تھے۔ ایسی صورتحال میں کوئی دل گردے والی ہی ٹیچر اس فلیٹ میں رہائش رکھنے کے لیے راضی ہو سکتی تھی۔ فلیٹ بدستور خالی چلا آ رہا تھا۔ کئی ایک لوگوں نے رات کے وقت اس فلیٹ سے پراسرار اور ڈراؤنی آوازیں سنی تھیں۔ لوگوں کی زبانی یہ پراسرار باتیں لیڈی ٹیچرز کے کانوں تک پہنچتی رہتی تھی۔ اسی لیے اب تک کوئی بھی ٹیچر اس فلیٹ میں رہائش رکھنے کی جرات نہیں کر سکی تھی۔

یہ تمام باتیں اور معلومات آفاق کو اپنے بزرگوں کے ذریعے حاصل ہوئی تھیں۔
آفاق ایک تعلیم یافتہ، بہادر اور سلجھا ہوا نوجوان تھا۔ غیر مرئی مخلوقات کو برحق ماننے کے باوجود ایسے سنے سنائے قصوں پر یقین کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ اس کے بیشتر یار دوست بھی اسے چڑیلوں اور جن بھوتوں کی کہانیاں اور چشم دید واقعات سناتے رہتے تھے لیکن ان تمام باتوں کا اس کے پاس صرف ایک ہی جواب ہوا کرتا تھا کہ ”جب میرے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش آئے گا تب میں مانوں گا۔“ اس کے دوست بچارے ایسا کرارا جواب سن کر چپ سادھ لیتے اور پھر آفاق ان کی خوب خبر لیتا مذاق اور اوٹ پٹانگ باتوں سے ان کا ناطقہ بند کر دیتا تھا۔

”یار، جنات جب آگ سے بنائے گئے ہیں تو پھر انہیں ڈرانے کے لیے پانی کیسا رہے گا؟“ ایسے ہی ایک دن دوستوں کی محفل میں اس نے شوشہ چھوڑتے ہوئے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”بچو اگر کسی دن جنات کے ہاتھ چڑھ گئے تو ششم کا دودھ بھول جاؤ گے۔“ شہزاد بونگے نے اپنی ناقص عقل کا استعمال کرتے ہوئے بیکار سا جواب دیا۔

”اوئے بونگے! ٹوٹے ہوئے ڈنگے۔ عقل سے کام لو ششم نہیں چھٹی کا دودھ ہوتا ہے اور دودھ یاد دلایا جاتا ہے بھلایا نہیں جاتا۔“ جلال عربی نے اپنی شیخ اسٹائل داڑھی کھجاتے ہوئے شہزاد بونگے کو لتاڑتے ہوئے کہا۔

"تم چپ رہو ریڈی میڈ عربی! یہ میرا اور آفاق کا معاملہ ہے۔ ویسے بھی فارسی میں چھٹی کو ششم ہی کہتے ہیں۔شہزاد بونگے نے اپنی ناقص عقل مندی کا ایک اور ثبوت پیش کیا۔ایسا مدلل جواب سن کر جلال عربی مارے غصّے کے افریقین سامنہ لے کر رہ گیا۔شہزاد بونگے نے ایک بونگا سا قہقہہ لگایا اور دوبارہ آفاق کی طرف متوجہ ہوگیا۔" ہاں تو تم کہہ رہے تھے جنات کو پانی سے ڈرایا جاسکتا ہے۔؟"

"اس میں ہرج ہی کیا ہے وہ اگر ڈرنا چاہیں تو۔" آفاق نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ اگر پانی سے ڈرنے لگتے تو پھران کی جناتی کا بھرم ٹوٹ جائے گا۔ایسی فضول باتیں بکنے سے بہتر ہے کہ تم جن بھائیوں سے پیشگی معذرت کرلو ورنہ کسی روز دینے کے دینے ہی پڑے جائیں گے۔" بونگے نے تنبیہی انداز میں آفاق کو جتلایا۔

"لینے کے دینے ہوتا ہے مسٹر بونگے۔ٹھیک مثال دیتے ہوئے شاید تمہاری زبان پر چھالے پڑتے ہیں۔"

"بونگا جو ٹھہرا۔زبان بھی بونگی ہی بولے گا ناں۔آفاق بھائی۔ کتے کی دم کو سیدھا کرنا ناممکن ہے۔" جلال عربی نے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے لقمہ دیا۔

"کہتے تو تم ٹھیک ہو جلال۔" آفاق نے کہا۔"بونگے کو ٹھیک کرنا خالی ہاتھ جنگلی سور پکڑنے کے مترادف ہے۔"

شہزاد بونگے نے قہر آلودہ نگاہوں سے ان دونوں کو گھورا اور ایک لمحہ توقف کے بعد بولا۔"اچھوں کو برداشت کرنا دنیا کی پرانی عادت ہے" بلیک اینڈ وائٹ فلموں کے ہیرو کی طرح اس کا لہجہ بھیک مانگنے والا تھا اور چہرے کا سائز شرقاً غرباً لمبا ہوگیا تھا۔" دیکھو دیکھو آفاق بھائی کیسے عمر رسیدہ اونٹ کی طرح اس کا چہرہ لٹک رہا ہے۔لگتا ہے جیسے ابھی ابھی اس کا والد ماجد دارفانی سے کوچ فرما گیا ہو۔" جلال عربی نے اپنی جگہ سے مینڈک کی طرح پھدکتے ہوئے کہا۔

"چلو چھوڑو ان باتوں کو کوئی کام کی بات کرو۔ ہر وقت کا بھونکنا اور کاٹنا کتوں کا وصف ہے۔" آفاق نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"آفاق بھائی، سنا ہے اس آسیب زدہ فلیٹ میں ایک لیڈی ٹیچر رہنے کے لیے

آ گئی ہے۔" جلال عربی رازدانہ لہجے میں بولا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا لیڈی ٹیچر تنہا اس فلیٹ میں رہ رہی ہے۔" آفاق نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں! کئی نہیں ہے مکمل فیملی کے ساتھ آئی ہے۔ سنا ہے اس کا شوہر کوئی حکیم ٹائپ کی چیز ہے جو یہیں اپنا مطب کھول رہا ہے۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے جنات اس سے معجون خریدا کریں گے۔" شہزاد بونگا جو بڑی مشکل سے ضبط کیے بیٹھا تھا فوراً بول اٹھا۔

"اف بونگے تجھ کسی کی آئی کیوں نہیں آتی۔تو ضرور کسی دن میرے ہاتھوں حلال نہیں تو حرام بہرصورت ہو جائے گا۔گدھے کہیں کے پوری بات تو سننے دیا کرو۔" آفاق اسے جھڑکتے ہوئے دوبارہ جلال عربی کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"تم کیا کہہ رہے تھے لیڈی ٹیچر کا شوہر حکیم ہے۔"

"سننے میں یہی آیا ہے پتہ کرنا پڑے گا۔شاید اس بیچارے کو اس منحوس فلیٹ کے بارے میں کسی نے بتایا نہیں ہوگا۔ ورنہ آسیب زدہ جگہ پر جان بوجھ کر کون رہتا ہے۔مفت میں جان سے جائے گا بیچارا۔" جلال عربی نے کف افسوس ملتے ہوئے جواب دیا۔

"کل ملیں گے اس سے انشاءاللہ پھر پوری بات واضح ہوگی۔قبل از وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" آفاق نے حتمی انداز میں کہا۔

"سوچ سمجھ کر بات کرنا آفاق بھائی۔اکثر حکیم جنات کے روپ میں ٹھہرتے رہتے ہیں۔" شہزاد بونگے کے لیے منہ بند رکھنا کاردار تھا۔

"جنات تو کبھی کبھار بونگے بن کر بھی پھرتے ہیں۔ میں کس کس سے بچتا پھروں گا۔" آفاق نے اس پر چوٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆

دوسرے دن آفاق اور جلال عربی حکیم صاحب کے مطب میں موجود تھے۔آفاق نے اپنا اور جلال عربی کا رسمی طور پر تعارف کرایا تو حکیم صاحب نے ناک پر دھرے ہوئے چشمے کے اوپر سے انہیں گھور کر دیکھا اور پھر ایک دم وہ کچھ اس انداز سے ہنسا جیسے آفاق نے اسے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔ ہنسنے سے اس کی باریک لٹکی ہوئی مونچھیں انگلی پر ڈالی گئی جرابوں کی طرح

ملنے لگیں۔ یہ منظر دیکھ کر جلال عربی باوجود ضبط کے اپنی ہنسی پر قابو نہ پا سکا۔ ''ہنس لو خوب ہنس لو۔ گول گپے کے منہ والے نامعقول انسان۔ مگر یاد رہے کہ زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔'' حکیم صاحب نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ حکیم صاحب کی بات سن کر جلال عربی کھسیانی سی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔

حکیم صاحب کی عجیب و غریب ہیئت دیکھ کر آفاق بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ بادی النظر میں جوکر نما نظر آنے والا یہ حکیم اسے اب کچھ پراسرار سا لگنے لگا تھا۔ تاہم اپنے اس خیال کا اظہار وہ نامناسب خیال کرتے ہوئے شائستہ انداز میں بولا۔ ''حکیم صاحب۔ ہم آپ کو اس آسیب زدہ اور پراسرار فلیٹ کے متعلق آگاہ کرنے کے لیے آئے ہیں جس میں آج کل آپ معہ فیملی کے رہائش پذیر ہیں۔ شاید لوگوں نے آپ کو اس منحوس فلیٹ کے پس منظر سے آگاہ نہیں کیا ہوگا۔ خیر ہم آپ کو بتانے آئے ہیں کہ وہ فلیٹ پراسرایت اور مافوق الفطرت مخلوق کا گڑھ ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ انجانے میں آپ کوئی نقصان اٹھا بیٹھیں۔''

''بھائی میرے میں تو خود ایک آسیب ہوں جس مریض کو چمٹ جاؤں مرتے دم تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا عربی بھائی ذرا نبض دکھانا تم مجھے کچھ بیمار نظر آ رہے ہو۔ تمہیں شاید ضعف جگر کا عارضہ لاحق ہے۔ تمہیں کوئی اچھا سا معجون استعمال کرنا پڑے گا۔'' آفاق کو نظرانداز کر کے حکیم صاحب اچانک جلال عربی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''مجھے تو یہ شہزاد بونگے کا بھائی بند نظر آ رہا ہے۔'' آفاق نے جلال عربی کو کہنی مارتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

''بونگے کو چھوڑو تم لوگ اپنی بات کرو۔'' حکیم کے نیم وا لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ چھا گئی۔ آفاق نے پریشان نظروں سے حکیم کی طرف دیکھا تو وہ ہنس کر بولا۔ ''دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ مجھے حکیم لقمان ثانی کہتے ہیں۔''

''میں معذرت خواہ ہوں حکیم صاحب کہ میں نے خواہ مخواہ آپ کی قوت سماعت کا امتحان لینا چاہا۔'' آفاق نے شرمسار انداز میں جواب دیا۔

''چلو اب قوت بصارت کا امتحان بھی لے لو۔'' حکیم صاحب کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولے۔ ''میں بتا سکتا ہوں کہ اس وقت تمہاری سامنے والی پاکٹ میں سو سو روپے کے تین اور دس دس روپے کے پانچ نوٹ موجود ہیں۔ جیب سے نوٹ نکال کر تسلی کر لو۔''

آفاق کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کی سامنے والی جیب میں کتنی رقم ہے اس نے میکانکی انداز میں جیب سے نوٹ نکالے اور پھر انہیں شمار کرنے کے بعد ہکا بکا رہ گیا۔ عین حکیم صاحب کے کہنے کے مطابق اس کی جیب سے سو سو کے تین اور دس دس روپے کے پانچ نوٹ برآمد ہوئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر جلال عربی کی آنکھیں بھی پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''صاحب... آپ... آپ تو بہت پہنچے ہوئے شخص ہیں۔ میں ایک بار پھر معافی کا خواستگار ہوں۔'' باوجود کوشش کے آفاق کو اپنی ندامت چھپانے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

''ارے بھائی میں تو تین دن پہلے کا پہنچا ہوا ہوں۔ شاید تم لوگوں کو اب معلوم ہوا ہے۔ خیر اس بات کو رہنے دو پہلے یہ بتاؤ کہ ٹھنڈا چلے گا یا...؟'' حکیم صاحب نے شفیق لہجے میں پوچھا۔

''حکیم صاحب۔'' آفاق نے پریشان کن انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ٹھنڈا گرم تو چلتا رہے گا اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہوں گا۔''

''یہی پوچھنا چاہتے ہو ناں کہ مجھے تمہاری جیب میں موجود رقم کے بارے میں کس طرح معلوم ہو گیا؟'' حکیم صاحب نے ایک بار پھر آفاق کو چونکاتے ہوئے پوچھا۔

''حکیم صاحب! خدا کی قسم آپ تو مجھے کوئی جادوگر لگ رہے ہیں۔ دل میں چھپی بات تک جان لیتے ہیں۔ میں نے آج تک آپ جیسی دلچسپ شخصیت نہیں دیکھی۔ آپ سے خوب نبھے گی۔'' آفاق کی آنکھوں میں حکیم صاحب کے لیے عقیدت و تحسین نظر آ رہی تھی۔

''برخوردار! دل میں چھپے بھید صرف اوپر والے کو معلوم ہیں۔ میں تو صرف چہرے پڑھنا جانتا ہوں۔ ویسے تمہاری جیب میں موجود رقم کے متعلق میں نے تکا لگایا تھا جو اتفاقاً نشانے پر بیٹھ گیا۔'' حکیم صاحب نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

اس پہلی ملاقات کے بعد آفاق اور حکیم صاحب کے درمیان دن بدن دوستی اور تعلقات پروان چڑھنے لگے۔ حکیم صاحب کی طرح اس کی شریک حیات اور بچوں نے بھی آفاق کو ہر موقعے پر حیران و پریشان کیا تھا۔ آفاق کی تعلیمی قابلیت اور ذہانت کو دیکھتے ہوئے ایک روز حکیم صاحب نے اس سے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ ''تم اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود

اپنے آپ کو ضائع کیوں کر رہے ہوں۔ کوئی ملازمت وغیرہ کیوں نہیں کر لیتے۔''

''کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی اور دوسرا میرے بزرگ نہیں چاہتے کہ میں اتنے بڑے زمیندار گھرانے کا چشم و چراغ ہو کر معمولی ملازمت کرتا پھروں۔'' آفاق نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''تو پھر ایسا کرو میرے بچوں کو ٹیوشن پڑھا دیا کرو۔ کچھ نہ کچھ تعلیم یافتہ ہونے کا حق ادا کرو۔ اس علم کا کیا فائدہ جو صرف صاحب علم تک محدود رہے۔''

''ٹھیک ہے اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو پھر پڑھا دیا کروں گا۔''

''بہت بہت شکریہ آفاق بیٹے۔ مجھے تم سے یہی امید تھی دراصل میرے دونوں بچے پڑھنے لکھنے میں کچھ کمزور واقع ہوئے ہیں۔ اب میرے سر سے بہت بڑی پریشانی ٹل گئی ہے۔ میں اس کام کا خاطر خواہ معاوضہ ادا کیا کروں گا۔''

''نہیں حکیم صاحب! میں پڑھانے کا معاوضہ بالکل نہیں لوں گا۔ اگر آپ اصرار کریں گے تو پھر کوئی اور ٹیوٹر ڈھونڈ لیں۔ آپ کے دونوں بچے میرے بہن بھائیوں کی طرح ہیں۔'' آفاق نے شکایتی انداز میں جواب دیا۔

''ارے بھائی! ناراض کیوں ہو رہے ہو۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ معاوضہ دینے کے لیے میرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں ہے البتہ جتنے معجون ضرورت ہو مفت ملیں گے۔ معجون مقوی دماغ تو بہرصورت استعمال کرنا ہی پڑے گا کیونکہ میرے دونوں بچے دماغ چاٹنے کے ماہر ہیں۔'' حکیم صاحب کی سنجیدگی نے پل بھر میں ظرافت کا روپ دھار لیا۔

''بالکل معاوضے کی جگہ معجون ٹھیک رہیں گے۔ لیکن ایک بات ہے معجون میٹھے ہونے چاہیں ورنہ مطلب میں پڑے اچھے لگ رہے ہیں۔'' آفاق بھلا کب پیچھے ہٹنے والا تھا۔

حکیم صاحب کے بچوں کو پڑھاتے ہوئے آفاق کو تین ماہ ہو چلے تھے۔ ان تین ماہ کے دوران کئی ایسے واقعات پیش آ چکے تھے جو بظاہر معمولی نوعیت کے ہوتے تھے لیکن آفاق کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ حکیم صاحب کی طرح اس کی بیوی اور دونوں بچے بھی بڑے بااخلاق، نمازی اور سلجھے ہوئے تھے۔ ان کی صحبت میں رہ کر آفاق خود بھی باقاعدگی کے ساتھ نماز پڑھنے لگا تھا۔ لیکن مسئلہ وہی تھا حکیم صاحب کا تمام خاندان آفاق کو کچھ عجیب قسم کا لگتا تھا۔ اس کے دونوں بچے بھی عام بچوں سے بہت مختلف تھے۔ حاضر جواب، انتہائی

درجے کے دلیر۔ اتنی کم عمری میں بھی ان کے سوچنے کا انداز بالغ تھا۔ بچی کی عمر لگ بھگ دس برس تھی جب کہ اس سے چھوٹے بھائی کی عمر سات برس تھی۔

حسب معمول ایک دن آفاق اندر کمرے میں دونوں بچوں کو پڑھا رہا تھا کہ باہر سے حکیم صاحب کی بیوی نے بچی کو پکار کر کہا ''جاؤ بیٹی جلدی سے بازار سے دودھ لے کر آؤ۔ تمہارے استاد صاحب کے لیے چائے بنانی ہے۔''

آفاق نے اشارے سے بچی کو جانے کے لیے کہہ دیا اور خود بچے کو پڑھانے لگ گیا۔ اسے امید تھی کہ بچی کی واپسی بیس پچیس منٹ کے بعد ہوگی۔ گو کہ یہ سرکاری فلیٹ بازار سے بالکل ملحق تھا لیکن دودھ والے کی دکان کافی فاصلے پر واقع تھی۔ وہاں آنے جانے میں پچیس منٹ تو لازمی طور پر صرف ہو جاتے تھے لیکن اس وقت آفاق کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب ٹھیک تین منٹ کے بعد بچی واپس کمرے میں داخل ہوئی۔'' ارے عاتکہ! تم اتنی جلدی بازار سے دودھ کیسے لے آئیں جبکہ دودھ والے کی دکان یہاں سے کافی دور ہے؟'' آفاق نے حیرت زدہ لہجے میں بچی سے سوال کیا۔

''وہ...... میں دوڑتے ہوئے گئی تھی؟'' عاتکہ نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ جواب دیا۔ البتہ آفاق کی نگاہوں سے اس کی مصنوعی تھکاوٹ چھپی نہ رہ سکی۔ اس لیے اس نے فوراً دوسرا سوال کر دیا۔'' مجھے لگتا ہے تم کچھ چھپا رہی ہو یا پھر اڑتے ہوئے گئی ہو؟ دوڑتا ہوا شخص تو اتنی جلدی نہیں پہنچ سکتا؟''

''سر ان باتوں کو رہنے دیجئے۔ وقت آنے پر آپ کو سب معلوم ہو جائے گا۔''

عاتکہ کے جواب میں ایک وقار تھا جس نے آفاق کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ ایک ہفتے کے بعد جب عیدالفطر کی چھٹیاں ہوئیں تو حکیم صاحب نے آفاق سے گزارشانہ انداز میں کہا۔'' بیٹے! ایک درخواست ہے امید ہے تم انکار نہیں کرو گے۔''

''جی فرمائیے بندہ حاضر ہے۔'' آفاق نے تابعداری کا مظاہرہ کیا۔

''بیٹے! بات دراصل یہ ہے کہ کل سے عید کی چھٹیاں ہو رہی ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ عید اپنوں میں مناؤں۔ اس لیے تمہیں ہم لوگوں کے جانے کے بعد اس فلیٹ کا دھیان رکھنا پڑے گا اور ہو سکے تو رات کے وقت یہیں سو جایا کرنا۔ یہ تمہارا ہم لوگوں پر احسان ہوگا۔''

''ارے حکیم صاحب! اس میں احسان والی کون سی بات ہے۔ آپ لوگ بے فکر کر

جائیں۔ میں فلیٹ کا دن رات دھیان رکھوں گا۔ آپ لوگ میرے اپنے ہیں کوئی غیر تو نہیں ہیں۔" اسی روز حکیم صاحب بمع اہل وعیال کے گھر سے چلے گئے کیونکہ دوسرے روز عید تھی۔ آفاق نے چاند رات فلیٹ میں بسر کی تھی۔ صبح جب اس نے یہ بات جلال عربی اور شہزاد بوگے کو بتائی تو وہ دونوں حیران رہ گئے۔ بلکہ بوگے نے تو باقاعدہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "اللہ میری توبہ تم آدمی ہو کہ بھوت۔ تم نے اکیلے اس آسیب زدہ فلیٹ میں رات کیسے بسر کر لی۔ کسی جن بھائی نے تمہیں کچھ نہیں کہا۔"

"ایک بونگا سا جن آیا تھا لیکن وہ اتنا بے وقوف تھا کہ میں نے اس سے بات کرنا بھی مناسب خیال کیا۔" آفاق نے بات کو ہنسی میں ٹالتے ہوئے جواب دیا۔

عید کے دو دن ہنسی خوشی میں گزر گئے۔ اس دوران رات کے وقت آفاق کے ساتھ فلیٹ میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ تیسرے دن شام سے تھوڑی دیر قبل مغرب کی طرف سے سیاہ بادل اٹھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اتنی زوردار بارش ہوئی کہ توبہ ہی بھلی۔ سرشام ہی لائٹ چلے جانے کی وجہ سے پورا شہر تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ ایک تو ویسے بھی موسم سرما تھا اور دوسرا بارش نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔

سخت سردی کی وجہ سے لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ آفاق بڑی مشکل کا سامنا کرتے ہوئے فلیٹ تک پہنچا تھا کیونکہ ان کی حویلی حکیم صاحب کے فلیٹ سے کافی فاصلے پر واقع تھی۔ راستے میں اسے انسان تو انسان کوئی آوارہ کتا بھی نہیں ملا تھا۔ رات کسی گنہگار کے دل کی طرح سیاہ تھی۔ ایک بار تو آفاق کے دل میں خیال گزرا کہ وہ واپس لوٹ جائے لیکن پھر اس کے خوف پر اس کی فطرتی دلیری غالب آ گئی۔ ویسے بھی اس کے پاس لوڈ ریوالور موجود تھا۔ ایمرجنسی کی صورت میں وہ استعمال کر سکتا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس نے فلیٹ کا باہر والا تالا کھولا اور کنڈی نکال کر اندر داخل ہو گیا۔ پیچھے سے دروازے کو کنڈی لگانے کے بعد وہ فلیٹ کے صحن میں سے گزرتا ہوا برآمدے میں پہنچ گیا۔ ہلکی ہلکی بارش بدستور جاری تھی۔ آفاق نے دائیں سائیڈ والا کمرہ کھولا اور اندر داخل ہو کر لالٹین جلا دی۔ کمرے میں خاطر خواہ روشنی ہو گئی تھی۔

سامنے والی ٹرالی پر امپورٹڈ ٹی وی سیٹ رکھا ہوا تھا۔ لیکن لائٹ کی غیر موجودگی میں وہ ٹی وی سے محظوظ نہیں ہو سکتا تھا۔ نیچے قالین پر ایک صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا۔ آفاق کے

پاس اب ٹائم پاس کرنے کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ تھا مطالعہ۔ چنانچہ اس نے شیلف میں لگی ہوئی کتابوں میں سے چند کتابیں منتخب کیں اور بستر میں گھس کر پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ لالٹین کو ایک چھوٹی سی تپائی نما ٹیبل پر رکھنے کے بعد اس نے بستر کے قریب کر دیا تھا تاکہ پڑھنے میں روشنی کا حرج نہ رہے۔

کافی دیر تک پڑھنے کے بعد وہ تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی تو رات کے ڈیڑھ بجے کا وقت تھا۔ باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ فضا پر ایک پراسرار سکوت اور سناٹا تھا۔ دور کہیں سے کسی آوارہ کتے کے بھونکنے کی آواز آئی اور ایک لمحے رات کا سناٹا مرتعش ہو کر رہ گیا۔ آفاق نے کتاب سے نگاہیں ہٹا کر پل بھر کے لیے شفاف شیشے کی کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا اور لرز کر رہ گیا۔ کالی سیاہ رات، لائٹ کی غیر موجودگی اور شام کے وقت کی بارش نے ماحول کو حد درجہ ڈراؤنا اور پراسرار بنا دیا تھا۔ گو کہ وہ غیر مرئی مخلوق سے کبھی بھی خائف نہیں ہوا تھا لیکن پھر بھی وہ ایک جیتا جاگتا انسان تھا۔ انسان جو احساس و جذبات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس میں دلیری بھی ہوتی ہے اور بزدلی بھی۔ دنیا کا کوئی بھی انسان ان صفات سے ماورا نہیں ہو گا۔ سو وہ بھی ایک انسان تھا اور اس وقت اس کے دل و دماغ میں کئی ڈراؤنے قسم کے خیالات آ رہے تھے۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اسے رات اس فلیٹ میں بسر کرنا تھی۔ اس کی آنکھیں نیند کے بوجھ سے آپس میں جڑی جا رہی تھی۔ لیکن ذہن سونے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ ایک انجانا سا خوف اسے لمحہ بہ لمحے گھیرتا جا رہا تھا۔ خطرہ جیسے کمرے کے باہر کہیں منڈلا رہا تھا۔

اس نے سرہانے کے نیچے دھرے ہوئے ریوالور کو تھپتھپایا اور لالٹین کی بتی نیچے کرنے کے بعد آیت الکرسی پڑھ کر دائیں کروٹ پہ سو گیا۔ اس کا چہرہ تک لحاف میں چھپا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے بعد اس پر غنودگی طاری ہو گئی لیکن انجانے خطرے کے پیش نظر اس کا شعور بیدار تھا۔ اچانک ساتھ والے کمرے سے اس کے کانوں تک ایسی آواز پہنچی جیسے کسی نے بڑے زور کے ساتھ سلائی مشین چلا دی ہو۔ اس نے ہڑبڑا کر لحاف سے چہرہ باہر نکالا اور کمرے کی اکلوتی کھڑکی پر نگاہیں جما دیں لیکن ماحول پر بدستور مکمل خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہو رہی تھیں۔ سخت سردی ہونے کے باوجود شدت خوف سے اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے رینگ رہے تھے۔ لمحہ بھر بیٹھے رہنے کے بعد وہ سلائی مشین کی

آواز کو ذہنی انتشار کا نتیجہ سمجھ کر دوبارہ چہرے پر لحاف ڈال کر سو گیا۔

پہلے کی طرح ایک بار پھر وہ غنودگی کی کیفیت میں تھا۔ جب اچانک اس کے کانوں میں کانچ کی چوڑیوں کے کھنکنے کی تیز آواز پڑی۔ چہرے سے یکدم لحاف ہٹا کر وہ اٹھ بیٹھا اور سرہانے کے نیچے سے ریوالور اٹھا کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ مگر اس کا ریوالور والا ہاتھ واضح طور پر کانپ رہا تھا۔ ''کک..... کون ہے؟'' اس نے مردہ سی آواز میں کھڑکی پر نگاہیں جما کر پوچھا۔

''دروازہ تو کھولو دلبر! میں کتنی دور سے تمہارے درشن کرنے کے لیے آئی ہوں۔''

کھڑکی کے قریب سے ایک میٹھی سی آواز ابھری اور اس کے ساتھ ہی ایک نسوانی ہیولہ کھڑکی کے شفاف شیشوں سے نظر آنے لگا۔

''کھڑ..... کی..... سے ہٹ جاؤ..... ور..... نہ میں..... فائر کر دوں گا۔'' اس نے حتی الوسیع لہجے کو بارعب بنانے کی کوشش کی مگر الفاظ اس کے منہ سے اٹک اٹک کر نکل رہے تھے۔

''دروازہ کھول دو دلبر۔ ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔'' نسوانی ہیولہ بارعب آواز میں مخاطب ہوا لیکن اس نے جواب دینے کی بجائے نسوانی ہیولے پر فائر جھونک دیا۔ کمرے میں ایک کان پھاڑ دھماکہ ہوا اور کھڑکی کا شیشہ زبردست چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ یکایک باہر سے چیخوں اور قہقہوں کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں اور پھر ایک دم فلیٹ کا صحن تیز روشنی میں نہا گیا۔ آفاق جس کی نظریں بدستور کھڑکی پر جمی ہوئی تھی باہر کا منظر دیکھ کر سر تا پا لرزنے لگا۔ فلیٹ کے صحن میں بیسیوں کی تعداد میں خوفناک اور ڈراؤنے چہروں والی مخلوقات دندناتی پھر رہی تھی۔ ان تمام بلاؤں کے جسم بالکل انسانوں کی طرح تھے لیکن چہرے خدا کی پناہ۔ کسی کا چہرہ سور کے چہرے جیسا تھا تو کسی کا بھیڑیے کی طرح، کسی کا شیر کی طرح تو کسی کا بھینسے جیسا۔ چند ایک چہرے انسانوں جیسے تھے مگر خوفناک حد تک ڈراؤنے اور وحشت انگیز تھے۔ جلے ہوئے، بگڑے ہوئے اور بالشت بھر نوکیلے دانتوں والے چہرے بھی موجود تھے۔ دو بڑے بڑے چہروں کے منہ سے زبان کی بجائے چار چار منہ والے سانپ پھنکار رہے تھے۔

اندر کمرے میں آفاق کی حالت لمحہ بہ لمحہ بگڑتی جا رہی تھی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے گر چکا تھا اور وہ بید مجنوں کی طرح لرز رہا تھا۔ قریب تھا کہ اس کے دل کی دھڑکنیں ساکت ہو جائیں اور وہ کھڑے کھڑے اگلے جہان کو سدھار جاتا جب اچانک اس کے کانوں میں ایک

مانوس سی آواز پڑی۔ ''گھبرانا نہیں بیٹے! میں آ گیا ہوں۔ اب یہ کفار کا ٹولہ تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔'' اسے پہچاننے میں دیر نہیں لگی یہ تو حکیم لقمان ثانی کی آواز تھی۔ حکیم صاحب کی آواز سن کر آفاق کی تیزی سے بگڑتی ہوئی حالت آہستہ آہستہ سنبھلتی گئی پھر جونہی اس نے کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھا تو حیران رہ گیا حکیم صاحب کے ساتھ دس خوبصورت اور کڑیل نوجوان تھے جنہوں نے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھام رکھیں تھی۔ پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے فلیٹ کا صحن میدان جنگ بن گیا۔ حکیم صاحب اور اس کے ساتھی تلواریں سونت سونت کر اس خوفناک مخلوق پر ٹوٹ پڑے۔ چیخ و پکار اور رونے دھونے کی آوازیں کان پھاڑ رہی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد فلیٹ کے صحن میں اس خوفناک مخلوق کے کٹے پھٹے اعضاء پڑے ہوئے تھے۔

حکیم صاحب اور اس کے ساتھی ابھی اس خوفناک جنگ سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ اچانک فلیٹ کے صحن میں پانچ بزرگ صورت شخص ظاہر ہوئے جنہیں دیکھ کر حکیم صاحب اور ان کے ساتھی مودب ہو گئے۔ پھر تقریباً آدھا گھنٹہ ان بزرگوں اور حکیم صاحب کے درمیان مذاکرات ہوتے رہے۔ آفاق کو صرف ان کے لب ہلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان کی آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ البتہ اسے کبھی کبھی حکم صاحب کے چہرے پر غصے کے تاثرات ضرور نظر آ جاتے تھے۔ پانچوں بزرگ باتوں کے دوران کبھی کبھی آفاق کی طرف اشارہ کر دیتے تھے۔ شاید ان مذاکرات میں آفاق کا ذکر بھی چل رہا تھا۔ ان مذاکرات کے فوراً بعد وہ پانچوں بزرگ کھڑے کھڑے غائب ہو گئے ان کے بعد حکیم صاحب کے ساتھی بھی آفاق کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ رفتہ رفتہ صحن میں وہ کٹے پھٹے اعضاء بھی غائب ہونے لگے۔

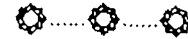
چند لمحوں کے بعد فلیٹ کے صحن میں صرف حکیم اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور کھڑکی کے قریب پہنچ کر آفاق سے بولا۔ ''بیٹے اب بلا جھجک دروازہ کھول دو۔ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' آفاق جو کافی حد تک اپنے آپ کو سنبھال چکا تھا۔ اس نے بغیر کسی تردد کے دروازہ کھول دیا۔ حکیم صاحب کمرے کے اندر داخل ہوئے اور آفاق کی پشت تھپک کر ستائشی انداز میں بولے۔ ''مجھے تم پر فخر ہے بیٹے۔ تم واقعی بہادر ہو۔''

''مگر حکیم صاحب! مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آئی یہ سب کیا تھا اور آپ کی یہاں موجودگی؟ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟'' اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

حکیم صاحب ایک طرف پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ''بیٹھ جاؤ میں تمہیں ساری بات بتاتا ہوں۔ یہ فلیٹ واقعی جنات کا مسکن ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے اس فلیٹ کی جگہ جو پرانی اور کچی حویلی تھی اس میں ہندو جنات کا بسیرا تھا۔ پھر وہ حویلی حصے بخروں میں تقسیم ہو کر اس فلیٹ تک محدود ہو گئی تو ہندو جنات نے اس فلیٹ کو اپنا مسکن بنالیا۔ میں نے اپنے قبیلے کے معززین کے ساتھ مل کر بڑی مشکل سے اس فلیٹ کو آزاد کرایا تھا اور پھر اپنے بیوی بچوں کو ساتھ لے کر انسانی روپ میں رہائش پذیر ہو گیا تھا تاکہ میری حکمت سے نوع انسانی بھی فائدہ اٹھا سکے لیکن مجھ سے بھول یہ ہو گئی تھی کہ میں نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک انسان کو یہاں ٹھہرا دیا تھا۔ بس یہی وجہ تھی اس خون ریز معرکے کی۔ ابھی چند لمحے قبل تمہاری آنکھوں کے سامنے ہمارے معزز قبیلوں کے معززین کے درمیان جو فیصلہ ہوا ہے اس میں یہ طے پایا ہے کہ اب اس فلیٹ میں جنات کا داخلہ بالکل ممنوع ہے نہ یہاں کوئی مسلم جن رہ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی غیر مسلم۔'' جونہی حکیم صاحب کی بات مکمل ہوئی اچانک اس کے بیوی بچے مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور آفاق انہیں دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔

''استاد صاحب...... ہمیں ابو نے آپ سے آخری ملاقات کے لیے بلایا ہے۔'' عاتکہ ہنستے ہوئے بولی۔

''ہاں آفاق! تم اپنے بھائی بہن اور بھابھی سے باتیں کرو۔ میں ذرا وضو کر لوں کیونکہ ابھی صبح کی آذان ہونے والی ہے۔'' حکیم صاحب اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے۔ ادائیگی نماز کے بعد آفاق نے افسردہ دل کے ساتھ اس معزز فیملی کو رخصت کیا اور بوجھل بوجھل قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔ حکیم صاحب نے اسے جاتے جاتے کہہ دیا تھا کہ زندگی رہی تو ضرور ملاقات ہوگی اور آفاق کو اس وقت شہزاد بوٹے کی بات شدت سے یاد آ رہی تھی جو اس نے اس دن مذاق میں کہی تھی کہ ''سوچ سمجھ کر بات کرنا آفاق بھائی اکثر حکیم جنات کے روپ میں بھی پھرتے رہتے ہیں۔''



انا گزیدہ

''تمہاری یہ خواہش بالکل بے تکی ہے۔ ایسی خواہش کوئی پرلے درجے کا احمق ہی کر سکتا ہے یا پھر پاگل۔'' شاہ زیب میری بات سن کر ایک دم جھنجھلا کر بولا۔

ایسی بات اگر کسی اور نے کی ہوتی تو شاید اب تک میں اسے دھکے مار مار کر حویلی سے باہر نکال چکا ہوتا۔ لیکن شاہ زیب میرے بچپن کا دوست تھا۔ اس نے ہر مشکل میں میرا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اس لیے میں اس کی ہر کڑوی بات اگنور کر دیتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ غصے سے نتھنے پھیلائے بیٹھا تھا اور مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ تاہم میں برا منائے بغیر التجائیہ انداز میں بولا۔'' شاہ زیب پلیز یار! میرے دکھ کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں سفینہ سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں، اتنی زیادہ کہ تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ میں...''

''بس بس۔'' وہ میری بات قطع کرتے ہوئے بولا۔ ''تم سفینہ سے محبت کرتے تو یوں ذرا ذرا سی بات پر اس کی انسلٹ کرتے نہ پھرتے۔ تم نے اسے اپنا قیدی بنا کر رکھا ہوا ہے مسٹر جہانگیر احمد۔ وہ بے چاری کسی بھی رشتہ دار مرد سے ذرا ہنس کر بات کیا کر لیتی ہے تم رقابت کا شکار ہو جاتے۔ ایسی محبت سے تو نفرت بہتر ہے۔ مجھے آج تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ تم چاہتے کیا ہو؟''

''میں کیا چاہتا ہوں یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ علی بابا تمہاری بات کبھی نہیں ٹالیں گے۔ تم صرف ایک بار ان سے میرا مسئلہ تو بیان کرو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ باآسانی ایسا کر سکتے ہیں جو میں چاہتا ہوں'' میں نے دوبارہ اس سے گزارشانہ انداز میں کہا۔

''جہانگیر احمد! کیا تمہیں سفینہ پر اعتماد نہیں ہے۔ احمق انسان! کیوں اس بے چاری کو پاگل کرنا چاہتے ہو۔ وہ تمہیں دل و جان سے چاہتی ہے لیکن تم سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے

اس کی زبان تمہارے تذکرے کرتے نہیں تھکتی۔ مگر تم ہمیشہ اسے شک کی نگاہوں سے دیکھتے رہتے ہو۔ شادی سے پہلے ہی تم اس کے پر کاٹ دینا چاہتے ہو۔ یہ خود غرضی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟'' شاہ زیب کے لہجے میں بدستور جھنجلاہٹ تھی۔

''نہیں یہ خود غرضی نہیں ہے۔ وہ میری ہونے والی بیوی ہے اور میں اسے اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہتا ہوں کوئی بھی غیرت مند مرد یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کی ہونے والی بیوی ایرے غیرے سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی پھرے۔'' میں نے اسے دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

''حماقت ہے تمہاری، زندہ رہنے کے لیے انسان کو دوسرے انسانوں سے رابطہ رکھنا پڑتے ہیں۔ اسے ہنسنا بھی پڑتا ہے اور رونا بھی۔ اسی کا نام زندگی ہے۔ کیا تم دیگر خواتین اور لڑکیوں سے ہنستے بولتے نہیں ہو؟''

''میں مرد ہوں۔ کچھ بھی کرتا پھروں، مجھ پر کوئی انگلی اٹھانے کی ہمت نہیں کرسکتا۔''

وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ واہ جہانگیر احمد واہ! کیا کہنے تمہارے۔ ایک جاگیردار سے یہی توقع کی جاسکتی ہے۔ تم ایسا کرو کہ بار بار سفینہ کو ڈانٹنے کی بجائے ایک ہی بار اس کی زبان کاٹ دو۔ پھر نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ اس سے بہترین مشورہ میں تمہیں نہیں دے سکتا۔''

میں نے اس کے طنز کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا" تم بے شک علی بابا سے میری سفارش مت کرو لیکن پلیز مجھے صرف ایک بار اس کے آستانے تک لے چلو۔ میں خود ہی منت سماجت سے کام چلا لوں گا۔''

''ٹھیک ہے یہ بھی کر دیکھتے ہیں۔ لیکن میری ایک شرط ہے۔ میں وہاں بالکل خاموش رہوں گا۔ تمہاری حمایت میں علی بابا سے میں ایک لفظ بھی نہیں بولوں گا۔''

''مجھے منظور ہے۔'' جھٹ سے جواب دیا۔

اسی دن عصر کے وقت میں اور شاہ زیب علی بابا کے آستانے پر پہنچ گئے۔ آستانے پر لوگوں کا ایک ہجوم سا اکٹھا تھا۔ وسیع و عریض کچے برآمدے میں علی بابا کھجور کی چٹائی پر تشریف فرما تھے اور لوگ باری باری ان کے پاس جا کر اپنے اپنے مسائل بیان کر رہے تھے۔

علی بابا ہر سائل کے ساتھ بڑی مروت اور شفقت کے ساتھ پیش آ رہے تھے اور ایسا

روح پرور اور پرسکون منظر میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ البتہ میں نے علی بابا کے بارے میں یہ ضرور سن رکھا تھا کہ وہ بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں اور انہیں روحانی علوم پر پوری دسترس حاصل ہے۔ وہ برسوں سے دکھی انسانیت کے غم بانٹ رہے تھے۔ آج تک کوئی بھی سائل ان کے دربار سے خالی ہاتھ نہیں لوٹا تھا۔ حقیقتاً وہ دکھی لوگوں کے لیے مسیحا تھے۔

میں شاہ زیب کے ساتھ چپ چاپ بیٹھا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ سائلین کی تعداد آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی اور میں دل ہی دل میں علی بابا سے مخاطب ہونے کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔

علی بابا کے سامنے اب ایک پختہ عمر کی خاتون اپنی نوعمر بیٹی کو لے کر بیٹھی ہوئی تھی۔ لڑکی کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے شعلے سے لپکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے اور وہ علی بابا کو قہر آلود نظروں سے گھور رہی تھی۔

''بولو ساجدہ بی بی! اب تمہاری بچی کی کیا کیفیت ہے؟'' علی بابا نرم لہجے میں اس خاتون سے مخاطب ہو کر بولے۔

''اس سے کیا پوچھتا ہے؟ مجھ سے پوچھ۔ بڑا طرم خان بنا پھرتا ہے۔ تو کیا سمجھتا ہے کہ تیری دھونس میں آ کر میں بھاگ جاؤں گا۔'' عورت کی بجائے اس کی لڑکی نے کڑکدار مردانہ آواز میں جواب دیا۔

وہاں موجود تمام لوگ متحیر انداز میں لڑکی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ علی بابا نے طنزیہ انداز میں بچی کی طرف دیکھا اور پھر پرسکون لہجے میں بولے۔ ''میں اگر طرم خان نہیں ہوں تو تو کون سا بہادر ہے۔ ایک معصوم بچی کا سہارا لے کر لڑائی لڑتا ہے۔ ہمت ہے تو خود سامنے آ۔ پھر دیکھنا تیرا کیا حشر ہوتا ہے۔''

''میرا نام عنش ہے اور عنش کا مطلب ہوتا ہے تباہی، ہلاکت۔ میں اگر سامنے آ گیا تو تیرے چودہ طبق روشن کر دوں گا۔ میری شکل دیکھ کر تیرے یہ سارے عقیدت مند دم دبا کر بھاگ جائیں گے۔'' لڑکی کی زبان سے دوبارہ مردانہ آواز ابھری۔

''ہم انسانوں کی ایک بہت بڑی مشہور کہاوت ہے کہ اونٹ اگر بیٹھا ہے تب بھی کتے سے بڑا ہوتا ہے۔ تو اگر اتنا ہی سورما ہے تو سامنے آ کر مقابلہ کیوں نہیں کرتا۔''

''علی بابا نے دوبارہ اسے چیلنج کرتے ہوئے جواب دیا۔

''تو ٹھہرا خاکی انسان اور میں ناری ہوں۔ بھلا خاکی کی کیا حیثیت ہے نار کے سامنے۔ پچھتائے گا کم عقل مجھے غصہ مت دلا ورنہ پٹک پٹک کر ماروں گا۔''

''تیسری نسل کے سب سے بڑے لعین ابلیس نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ اگر دم ہے تو بچی کو چھوڑ کر اپنی مکروہ صورت میں میرے سامنے آجا ایک لمحے میں فیصلہ ہو جائے گا۔ تجھے خاکی اور ناری کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔''

''لے پھر تیار ہو جا مجھے تیرا چیلنج منظور ہے۔ تجھے جہنم رسید کرنے کے بعد میں دوبارہ اس لڑکی کے جسم میں سرایت کر جاؤں گا بلکہ اب تو میں اسے اپنی دنیا میں لے کر جاؤں گا جہاں کسی خاکی کا وجود بھی نہیں ہوگا۔''

جونہی لڑکی کی زبان سے عنش کا آخری جملہ برآمد ہوا اس پر غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے جسم سے دھوئیں کا ایک مرغولہ فضاء میں بلند ہونے لگا۔ تمام حاضرین دم سادھے یہ خوفناک منظر دیکھ رہے تھے۔ چند ایک لوگ واضح طور پر کانپ رہے تھے خود میری اور شاہ زیب کی حالت دیدنی تھی۔ مگر علی بابا کے نورانی چہرے پر خوف کا ہلکا سا شائبہ تک نہیں تھا۔

یکا یک اس دھوئیں نے ایک خوفناک روپ دھار لیا کالی سیاہ رنگت، سر پر بڑے بڑے نوکیلے سینگ، چہرہ سور سے ملتا جلتا اور منہ سے زبان کی بجائے چار سیاہ ناگ پھن اٹھائے پھنکار رہے تھے۔ قد دس فٹ سے بھی کچھ زیادہ تھا۔

یہ خوفناک منظر دیکھ کر وہاں موجود لوگ اٹھ کر بھاگ کھڑے ہوئے انہوں نے اپنے اپنے جوتے تک پہننے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ساجدہ خاتون بھی بے ہوش ہو چکی تھی اور میں شاہ زیب کا بازو تھامے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

شاہ زیب نے سرگوشیانہ انداز میں مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''جہانگیر! ڈرو مت۔ علی بابا اس سے بھی خوفناک جنات سے نمٹ چکے ہیں۔ یہ علی بابا کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔''

''میں نے کہا تھا ناں! کہ میرا نام عنش ہے۔ اب سنبھل جا، میں وار کرنے لگا ہوں۔ تیرے اسی دربار کو تیرا مقبرہ بنا دوں گا۔'' شکل کی طرح عنش کی آواز بھی بھیانک تھی۔

''تو کیا میرا مقبرہ بنائے گا مردود! اب تیری آنکھ جہنم میں کھلے گی۔ چل پہلے وار کر کے اپنی حسرت پوری کر لے کیونکہ اس کے بعد تجھے وار کرنے کی مہلت نہیں ملے گی۔'' علی بابا

پہلی بار طیش میں آ کر بولے۔

جونہی علی بابا کی بات پوری ہوئی عنش کے منہ سے آگ کا ایک شعلہ سا نکل کر علی بابا کی طرف بڑھنے لگا۔ چشم زدن میں علی بابا نے اپنا دایاں ہاتھ سیدھا کیا اور پھر ان کی پانچوں انگلیوں سے پانی کی تیز دھاریں نکل کر شعلے پر پڑنے لگیں دیکھتے ہی دیکھتے شعلہ فضا میں بجھ کر رہ گیا۔

اپنے پہلے وار کو ناکام جاتے دیکھ کر عنش نے منہ سے زور دار پھونک ماری تو چاروں ناگ اس کے منہ سے نکل کر زمین پر رینگنے لگے۔ مگر اس سے قبل کہ وہ علی بابا تک پہنچتے۔ علی بابا نے زیر لب کچھ پڑھا اور پھر یکا یک چار جسیم نیولے برآمدے کی چھت سے کود کر ناگوں پر جھپٹ پڑے۔

علی بابا کے لبوں پر مسکراہٹ رونما تھی اور وہ بڑی محویت کے عالم میں نیولوں اور ناگوں کی لڑائی دیکھ رہا تھا۔ برآمدے کی پکی زمین پر نیولے ناگوں کو گھسیٹتے پھر رہے تھے۔ میں اور شاہ زیب دونوں سہمے ہوئے انداز میں بیٹھے یہ ہوش اڑا دینے والی جنگ دیکھ رہے تھے۔ دو نیولوں کے منہ میں ناگوں کے پھن آ چکے تھے اور ناگ بل کھا کھا کر تڑپ رہے تھے۔ ذرا دیر بعد دونوں ناگ ٹکڑوں کی صورت میں زمین پر بکھرے ہوئے تھے۔

بقیہ دو ناگ بھرپور انداز میں اپنے حریف نیولوں سے برسرپیکار تھے اور ان پر بھاری پڑ رہے تھے لیکن ان کی بدقسمتی کہ ناگوں کو ٹھکانے لگانے والے دونوں نیولے اب اپنے ساتھیوں سے مل چکے تھے۔ اب نیولے چار تھے اور ناگ دو رہ گئے تھے۔

بے چاروں نے نیولوں سے بچنے کے لیے شدید جنگ لڑی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ نیولوں نے ان کا حشر بھی بقیہ دو ناگوں کی طرح کر ڈالا تھا۔ ناگوں کو مار ڈالنے کے بعد چاروں نیولے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گئے۔

علی بابا نے ناگوں کے جہنم رسید ہوتے ہی کڑکدار آواز میں عنش سے کہا۔

''ابلیس کی اولاد اب خود آ جا میدان میں، تاکہ میں تجھے ناری اور خاکی کا مطلب بتا دوں۔ چند لمحے قبل تو نے ہی کہا تھا ناں کہ میرے عقیدت مند تیری شکل دیکھ کر ہی بھاگ جائیں گے لیکن دیکھ لے جو میرے صحیح عقیدت مند تھے اب بھی اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ آج میرا ہی ایک عقیدت مند تجھے ناری اور خاکی کا بھاؤ بتا دے گا۔ لڑنے کے لیے تیار ہو جا۔'' اتنا

کہہ کر علی بابا نے اپنے دونوں ہاتھ فضاء میں بلند کیے اور دوسرے ہی لمحے ان کے ہاتھوں میں دو لشکتی ہوئی تلواریں موجود تھیں۔ انہوں نے ایک تلوار عنش کی طرف پھینکی جسے اس نے ہوا میں ہی کیچ کرلیا اور دوسری تلوار ہاتھ میں لے کر وہ ہم دونوں کی طرف بڑھے اور شاہ زیب سے مخاطب ہوکر بولے۔ ''اٹھ میرے بچے! تلوار پکڑ اور اللہ کا نام لے کر اس مردود کے پرخچے اڑا دے۔ انشاء اللہ فتح تمہاری ہوگی۔ باطل کے خلاف لڑنا جہاد ہے۔ یہ ایک انسان اور جن کی جنگ نہیں ہے بلکہ حق و باطل کا معرکہ ہے۔''

علی بابا کا حکم سن کر شاہ زیب میکانکی انداز میں اپنی جگہ سے اٹھا اور تلوار پکڑ کر ایک ولولے اور جوش کے ساتھ عنش کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

عنش نے اسے دیکھ کر ایک مکروہ قہقہہ لگایا اور نفرت سے بولا۔ ''یہ بڈی کا بچہ میرا مقابلہ کرے گا۔ کیوں اسے بے موت مروانا چاہتا ہے اس کی تو میں ''

ابھی اس کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ شاہ زیب اندھا دھند تلوار تھام کر اس پر ٹوٹ پڑا۔ عنش ایکدم بوکھلا کر الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ اسی اثناء میں علی بابا کی پرجوش آواز سنائی دی۔ ''شاباش میرے بچے! ہمت سے کام لے اب اس کا کوئی سحر تم پر نہیں چلے گا۔ میں نے اس کے سارے موکلوں کو باندھ کر رکھ دیا ہے اب یہ محض ایک لمبا اور بے ڈھنگا سا جسم ہے۔''

شاہ زیب کے ہاتھ میں تلوار بجلی کی مانند کوند رہی تھی۔ عنش اس کے تابڑ توڑ حملوں سے بچنے کے لیے نہایت ہی بے ڈھنگے انداز میں تلوار گھما رہا تھا۔ علی بابا اور میں خاموشی کے ساتھ تلواروں کی جھنکار سن رہے تھے۔

اچانک عنش نے پینترا بدلا اور اس کی تلوار شاہ زیب کی قمیض کی آستین پھاڑتی ہوئی گزر گئی۔ شاہ زیب اس غیر متوقع حملے کی تاب نہ لا کر پشت کے بل گر پڑا۔ عنش نے اسے گرتے دیکھ کر بڑی سرعت کے ساتھ اس پر وار کرنے کی کوشش کی لیکن شاہ زیب بڑی تیزی کے ساتھ کچی زمین پر کروٹ پر کروٹ بدلتا گیا۔ عنش کی تلوار ہر بار زمین پر ٹکرا کر رہ جاتی، لیکن وہ شاہ زیب کو اٹھنے کا موقع نہیں دے رہا تھا تاہم شاہ زیب کا ہاتھ بدستور تلوار کے دستے پر مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ علی بابا یہ صورتحال دیکھ کر کچھ متفکر نظر آ رہے تھے۔

یکا یک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے چلا کر شاہ زیب سے بولا۔ ''کم

آن شاہ زیب! مارشل آرٹ سے کام لو۔ مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ جیت تمہاری ہوگی۔''

جونہی میری آواز شاہ زیب کے کانوں میں پڑی وہ پلک جھپکنے کی دیر میں الٹی قلا بازی کھا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ شاہ زیب کالج لائف میں مارشل آرٹ کا ماہر رہ چکا تھا اس کے پاس بلیک بیلٹ تھی اور وہ متعدد مقابلے جیت چکا تھا۔

اب شاہ زیب عنش کی تلوار کی پہنچ سے دور چھ سات قدموں کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ عنش صورتحال کو سمجھتا۔ اچانک شاہ زیب اپنی جگہ سے فضاء میں اچھلا اور اس کی بھرپور کک عنش کے چہرے پر پڑی۔ تلوار عنش کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر گر پڑی۔

عنش نے تیزی کے ساتھ جھک کر تلوار اٹھانے کی کوشش کی مگر اسے دیر ہو چکی تھی۔ شاہ زیب کی دوسری بھرپور کک اس کی پشت پر پڑی اور منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ دوسرے ہی لمحے شاہ زیب کی تلوار گرتے ہوئے عنش کی پیٹھ سے گزرتی ہوئی زمین سے جا ٹکرائی۔ عنش کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور وہ زمین پر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔

شاہ زیب نے خون آلودہ تلوار کو دوبارہ فضاء میں بلند کیا اور عنش کی گردن دھڑ سے الگ ہوکر زمین پر لڑھکتی چلی گئی۔ تھوڑی دیر تڑپنے کے بعد عنش کا وجود ساکت ہوگیا۔

علی بابا نے فرط جذبات سے آگے بڑھ کر شاہ زیب کو گلے سے لگالیا۔

''شاباش میرے بچے! تم نے اپنے خاکی ہونے کا ثبوت دے کر یہ ثابت کردیا ہے کہ خاک، نار سے افضل تھی۔ افضل ہے افضل رہے گی۔''

ذرا دیر بعد علی بابا کے تین معتقد خاص ایک کمرے سے نکلے اور مردہ عنش کے جسم کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ اسی دوران ساجدہ خاتون اور اس کی بچی بھی ہوش میں آ چکی تھی۔

علی بابا نے بچی کے ہوش میں آتے ہی اس پر دم کیا اور پھر ساجدہ خاتون سے مخاطب ہوکر بولے۔ ''جاؤ بی بی اب بے فکر ہو جاؤ انشاء اللہ اب تمہاری بچی پر کبھی کوئی دورہ نہیں پڑے گا۔'' ساجدہ خاتون علی بابا کو دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوگئی۔

ساجدہ خاتون کے رخصت ہونے کے بعد علی بابا شاہ زیب کی طرف متوجہ ہوئے۔

''بیٹے! کیسے آنا ہوا، گھر میں تو خیریت ہے ناں''

''ہاں سائیں سب خیریت ہے۔ دراصل میرا دوست جہانگیر احمد آپ سے ملنے

کے لیے بے تاب تھا۔ شاید اسے آپ سے کوئی کام ہے اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس کی بات سن لیں۔'' شاہ زیب نے مودب لہجے میں جواب دیا۔

شاہ زیب کی بات سن کر علی بابا نے میری طرف جواب طلب نظروں سے دیکھا تو لمحے کے لیے تو میں گڑبڑ کر رہ گیا۔ لیکن پھر سنبھل کر بولا۔'' سائیں! مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے اگر آپ کو ناگوار خاطر نہ گزرے تو میں اپنا مسئلہ بیان کردوں؟''

''ضرور بیان کرو بیٹے! اگر شرع کے خلاف نہ ہوا تو میں ضرور حل کرنے کی کوشش کروں گا''

''سائیں! میں چاہتا ہوں کہ میری ہونے والی بیوی جس کا نام سفینہ ہے۔ میرے علاوہ کسی مرد سے بات تک نہ کرے۔ چاہے وہ مرد میرا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔'' میں نے بغیر کسی تمہید کے جواب دیا۔

علی بابا نے متحیر انداز میں میری طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر بولے۔'' تمہارا یہ خیال مثبت نہیں ہے بیٹے! وہ اگر واقعی تم سے سچی محبت کرتی ہے تو پھر بے فکر رہو۔ وہ زندگی بھر تمہاری ہی رہے گی۔ اس پر ناجائز پابندیاں لگانا اچھی بات نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ کسی رشتے دار مرد سے ایسا ویسا کوئی رابطہ رکھتی ہے تو پھر مجھے بتاؤ۔''

''نہیں سائیں ایسا تو وہ بھول کر بھی نہیں کرسکتی بس میں اسے کسی اور مرد سے بولتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ سائیں مہربانی فرما کر میرا یہ مسئلہ حل کردیں میں آپ کو منہ مانگا نذرانہ پیش کروں گا۔''

''نہیں بیٹے! تو غلط جگہ پر آ گیا ہے کوئی اور در کھٹکھٹا۔ ایسا کام میں کسی صورت نہیں کروں گا۔ تو چاہے میرے سامنے دولت کے ڈھیر لگا دے تب بھی میں یہ کام نہیں کروں گا۔'' علی بابا نے صاف انکار کرتے ہوئے جواب دیا۔

''پھر ہمیں اجازت دیجئے سائیں! آپ کی بہت بہت مہربانی میں کوئی اور ڈھونڈ لوں گا۔''

یہ کہہ کر شاہ زیب کی طرف متوجہ ہو گیا۔'' چل اٹھ چلیں یار، خواہ مخواہ وقت ضائع کیا ہے۔''

شاہ زیب نے معذرت خواہانہ انداز میں علی بابا کی طرف دیکھا مگر وہ سنجیدہ لہجے میں

بولے۔'' جاؤ بیٹے جاؤ تمہارا دوست نادان ہے۔ اسے سمجھانے کی کوشش کرو ایسا نہ ہو کہ یہ انجانے میں نقصان اٹھا بیٹھے''

شاہ زیب نے علی بابا کو خدا حافظ کہا اور پھر میرے پیچھے چلتے ہوئے آستانے سے باہر نکل آیا۔ مجھے رہ رہ کر علی بابا پر غصہ آ رہا تھا اور اس لیے میرا چہرا اترا ہوا تھا۔ شاہ زیب کو بھی میری اندرونی کیفیت کا اندازہ تھا اسی لیے وہ سیریس انداز میں بولا۔

''کیوں پریشان ہو رہے ہو یار۔ ضروری تو نہیں ہے کہ انسان کی ہر خواہش پوری ہو جائے۔ سفینہ کوئی چابی سے چلنے والا کھلونا نہیں ہے۔ ایک جیتی جاگتی لڑکی ہے۔''

''میں اسے چابی سے چلنے والا کھلونا ہی بنا کر چھوڑوں گا اس شہر میں علی بابا کے علاوہ کوئی بھی ایسا شخص ضرور ہوگا جو میرا یہ کام کردے گا۔ روپے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔'' میں نے پرعزم لہجے میں جواب دیا۔

''جو مرضی آئے کرو یار لیکن میری ایک بات یاد رکھنا ہر عمل کا ردعمل ضرور ہوتا ہے۔ اپنی سوچ کو مثبت رکھو گے تو نتائج بھی مثبت ہی برآمد ہوں گے۔''

''بس بس زیادہ ناصح بننے کی کوشش مت کرو۔'' میں نے جھنجھلا کر کہا اور شاہ زیب خاموش ہو گیا۔''

ٹھیک چار روز بعد ایک ہندو پنڈت دیال چند کے سامنے بیٹھا اپنا مسئلہ بیان کر رہا تھا۔ دیال چند کے متعلق میں نے ایک اخبار میں پڑھا تھا۔ وہ کالے علم کا ماہر تھا بہت سے ناقابل یقین کارنامے سرانجام دے چکا تھا۔ میری پوری بات سننے کے بعد وہ بولا'' بالکل یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ سمسیا کا کوئی نہ کوئی اپائے ضرور ہوتا ہے۔''

''پنڈت جی! میں آپ کو اس کام کا منہ مانگا معاوضہ دوں گا۔ آپ بس کسی طرح بھی ممکن ہو میرا یہ کام کردیں آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔'' میں نے جھٹ سے جواب دیا۔

پنڈت دیال چند نے ایک ثانیے کے لیے سوچا پھر سنجیدہ انداز میں بولا۔'' تو ایسا کر مجھے اس کنیا کے سر کے بال لا دے۔ پھر میں کچھ نہ کچھ ضرور کردوں گا۔''

''میں کل ہی پہنچ جاؤں گا بال لے کر''۔ میں نے پرمسرت لہجے میں کہا اور پنڈت دیال چند نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ رات کو میں نے سوئی ہوئی سفینہ کے تھوڑے سے بال کاٹے اور صبح سویرے ناشتہ کرنے کے بعد دوبارہ پنڈت دیال چند کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ اس

نے مجھے دیکھتے ہی سوالیہ انداز میں پوچھا۔ ''کیا کنیا کے سر بال لے آئے ہو؟''

''جی ہاں پنڈت جی۔'' میں نے جیب سے بال نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

''تم تھوڑا سے یہاں بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔ میں ابھی ایک عمل سے فارغ ہو کر آتا ہوں۔'' پنڈت دیال چند مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد وہ باہر نکلا تو اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا اور آنکھیں انگاروں کی طرف دہک رہی تھیں۔ باہر آتے ہی اس نے دو پڑیاں میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''بالک! ان دونوں پڑیوں میں سیاہ رنگ کا سفوف ہے۔ ان میں جو بڑی پڑیا ہے وہ تمہیں آج رات قبرستان میں جا کر کسی بہت ہی پرانی قبر میں دفن کر دینی ہے۔ اس کے بعد جو دوسری پڑیا ہے۔ اس کا سفوف سات دن تک بلاناغہ صبح شام کنیا کے کھانے میں ملانا ہے۔ چٹکی بھر سے زیادہ سفوف کھانے میں نہیں ملانا۔ کنیا کو اگر ذرا بھی شک ہو گیا تو پھر بہت ہی برا نتیجہ نکلے گا۔ ساتویں روز رات کے کھانے کے بعد کنیا تمہاری بے دام غلام بن چکی ہو گی۔ اسی رات وہ خود چل کر تمہارے کمرے میں پہنچ جائے گی پھر تمہاری مرضی کے خلاف وہ غیر مرد تو کیا کسی غیر عورت سے بھی نہیں بولے گی''

''بہت بہت مہربانی پنڈت جی! بولیے اب میں آپ کی کیا سیوا کروں۔'' میں نے پتلون کی جیب سے پھولا ہوا پرس نکالتے ہوئے پوچھا۔

''زیادہ نہیں بالک صرف دس ہزار روپے'' پنڈت دیال چند نے بلاتردد جواب دیا۔

میں نے پرس سے ہزار ہزار کے دس نوٹ نکال کر اس کے حوالے کیے اور اس سے اجازت لینے کے بعد خوشی سے گنگناتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔ مجھے رہ رہ کر نجانے کیوں علی بابا پر ہنسی آ رہی تھی۔ بے چارا غریب آدمی ہر وقت اپنی عاقبت کی ہی سوچتا رہتا ہے گھر آئی آسائش کو ٹھکرا کر بھی مسرور رہتا ہے۔

یہی کچھ سوچتے ہوئے میں اپنی گاڑی تک پہنچ گیا۔ گاڑی میں نے دیال چند کے ٹھکانے سے ذرا دور پارک کی تھی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد میں نے کچھ دیر تک ٹی وی پروگرامز دیکھے اور پھر گاڑی نکال کر قبرستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ امی نے سرسری طور پر مجھ سے پوچھا تو میں نے ایک دوست سے ملنے کا بہانہ بنا دیا۔ ویسے بھی ابو کی وفات کے بعد میں

بالکل آزاد ہو گیا تھا۔ گھر میں امی، سفینہ اور میری چھوٹی بہن نادیہ کے علاوہ ایک نوکرانی اور ایک خانسامہ اور ایک مالی تھا۔ سفینہ کے والدین اس کے بچپن میں ہی ایک حادثے میں چل بسے تھے۔ ابو نے اپنے چھوٹے بھائی اور بھابھی کی حادثاتی موت کے بعد سفینہ کو بڑے ناز و نعم کے ساتھ پالا تھا۔ وہ میرے ساتھ ہی کھیل کود کر جوان ہوئی تھی۔ اس لیے اس کی محبت میں میرا گرفتار ہو جانا ایک فطری عمل تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری محبت نے دیوانگی کا روپ دھارا اور پھر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ میں کسی بھی مرد کے ساتھ سفینہ کا بولنا گوارا نہیں کرتا تھا۔ پہلے پہل تو میں نے سفینہ کو منت سماجت سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن جب اس طرح کام نہ ہوا تو بات ڈانٹ ڈپٹ تک پہنچ گئی۔

آخر کار تنگ آ کر میں نے متبادل راستہ ڈھونڈنے کی کوشش شروع کر دی پھر اسی کوشش نے مجھے دیال چند تک پہنچا دیا۔

گاڑی میں نے قبرستان سے ذرا دور ہی روکی تھی اس لیے مجھے قبرستان تک پہنچتے پہنچتے دس منٹ لگ گئے۔ میں اگر چاہتا تو یہ کام گورکن کو تھوڑی بہت رشوت پیش کر کے باآسانی کروا سکتا تھا لیکن پنڈت دیال چند کے کہنے کے مطابق یہ کام میں نے اپنے ہاتھوں سے سرانجام دینا تھا۔

قبرستان بالکل اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور ماحول پر ایک پراسرار اور جان لیوا سکوت طاری تھا۔ کبھی کبھی کسی جھینگر کی آواز اس سکوت کو مرتعش کرتی تو میں لرز کر رہ جاتا تھا اور میرا دل اس تیزی سے دھڑکتا جیسے پہلو چیر کر باہر آنا چاہتا ہو۔ میری جیب میں لوڈ ریوالور موجود تھا لیکن پھر بھی میں ڈر رہا تھا۔

علی بابا کے دربار میں شاہ زیب کے ہاتھوں مرنے والے جن عنش کی شکل بار بار میری نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ گھر سے نکلتے وقت میں از حد دلیر بنا ہوا تھا لیکن اب میرے حوصلے ریت کی دیوار کی طرح تھے۔ میں واپس لوٹنا چاہتا تھا لیکن ناکامی کا تصور مجھے آگے بڑھنے پر مجبور کر رہا تھا۔

گورکن کی کوٹھڑی سے بچتے بچاتے میں قبرستان کے درمیان پہنچ گیا۔ جیب سے پنسل ٹارچ نکال کر میں نے جلدی سے پرانی قبر کھوجنا شروع کر دی۔ ٹارچ کی روشنی اتنی کم تھی کہ مجھے بمشکل دکھائی دے رہا تھا۔ ابھی تک مجھے اپنے مطلب کی قبر نظر نہیں آئی تھی۔ جوں

جوں وقت گزر رہا تھا میری پریشانی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں جلد از جلد قبرستان سے نکلنا چاہتا تھا لیکن پرانی قبر مجھے کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

اچانک میرے کانوں میں ایسی آواز پڑی جیسے کسی نے زور سے سانس اندر کھینچا ہو۔ ایک لمحے کے لیے تو میں شل ہو کر رہ گیا مگر پھر اس آواز کو اپنا وہم سمجھ کر دوبارہ پرانی قبر کی تلاش شروع کر دی۔

آخر کار بڑی تگ و دو کے بعد میں اپنے مطلب کی قبر ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے جلدی سے جیب سے سفوف کی پڑیا نکالی اور قبر کے قریب اکڑوں بیٹھ کر ایک ہاتھ سے قبر کی مٹی ہٹانا شروع کر دی۔ جوں جوں میں قبر میں سوراخ کرتا جا رہا تھا توں مجھ پر خوف طاری ہوتا جا رہا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ کانپ رہے تھے اور جسم پسینے سے شرابور ہوتا جا رہا تھا۔

یکا یک ہوا کا ایک تیز جھونکا چلا اور قبرستان میں بکھرے سوکھے پتے پھڑ پھڑاہٹ کی آواز کے ساتھ اڑنے لگے۔ خوف کی ایک سرد لہر جو میرے پورے وجود میں سرایت کر گئی اور میں یکدم قبر سے مٹی ہٹاتے ہٹاتے رک گیا۔

ایک لمحہ کے بعد جب میرے حواس اعتدال پر آئے تو میں نے دوبارہ پنسل ٹارچ کی روشنی قبر پر ڈالی۔ اف میرے خدایا! منظر دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ قبر خود بخود درمیان سے پھٹتی جا رہی تھی اور شدت خوف سے میری آنکھیں حلقوں سے باہر آ رہی تھیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے قبر دولخت ہو گئی۔ میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ٹارچ کی روشنی قبر کے اندر ڈالی اور پھر بے اختیار میرے لبوں سے ایک دہشت ناک چیخ نکل گئی۔ قبر کے اندر کا منظر اس قدر خوفناک تھا کہ مجھے اپنے بدن سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ قبر کے مردے کی شکل تارکول کی طرح سیاہ تھی، سر پر بالوں کی بجائے گز گز بھر کے سیاہ سانپ لہرا رہے تھے۔ آنکھوں کی جگہ صرف دو گڑھے تھے جن میں مختلف قسم کے کیڑے کلبلا رہے تھے۔ کشادہ دہانے میں سے جھانکتے ہوئے نوکیلے دانت ضرورت سے زیادہ لمبے تھے۔ خدا کی پناہ دانت تھے کہ برچھیاں۔

سفوف کی پڑیا اور ٹارچ میرے ہاتھوں سے نکل کر گر چکی تھیں۔ میں سرتاپا کانپ رہا تھا۔ مجھے اپنی موت یقینی نظر آ رہی تھی اور مجھ میں ہلنے جلنے کی سکت بالکل نہیں رہی تھی۔ اچانک

میری نظروں کے سامنے سفینہ، امی اور نادیہ کی صورتیں گھومنے لگیں۔ میرے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی اور میں ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ بھاگتے بھاگتے اچانک میں نے ٹھوکر کھائی اور منہ کے بل ایک قبر پر گر پڑا۔ ابھی میں سنبھلا بھی نہیں تھا کہ قبر کے اندر سے دو استخوانی ہاتھ باہر نکلے اور میرے گلے کے گرد کس گئے۔ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ عالم جنون میں میں نے ان استخوانی ہاتھوں کو زور سے جھٹکا دیا تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئے۔ میں دوبارہ اٹھ کر بھاگا لیکن چند قدم بھاگنے کے بعد پھر گر پڑا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کسی نے مضبوطی سے میرے پاؤں جکڑ رکھے ہوں۔ میں نے ہاتھوں کی مدد سے پیروں کو ٹٹولنے کی کوشش کی تو ایک مرتبہ پھر چیخ پڑا۔ رسی کی بجائے میرے پیروں سے سانپ لپٹے ہوئے تھے۔ موت کے خوف نے مجھے دھاڑیں مار مار کر رونے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے جو کبھی کسی کو خاطر میں نہیں لایا کرتا تھا آج کتنی بے بسی اور لاچاری کے ساتھ ایک ٹوٹی ہوئی قبر پر پڑا اپنی موت کا انتظار کر رہا تھا۔ میرا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور روتے روتے میری ہچکی بندھ چکی تھی۔ آج میرا سارا غرور اور انا پرستی آنسوؤں کے ساتھ بہہ نکلی تھی۔

اس شیطانی چکر سے نکلنا میرے بس سے باہر تھا۔ یونہی روتے روتے اچانک کسی خیال کے تحت میرے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھ گئے اور پھر میرے لبوں سے پرسوز آواز نکلی۔ "اے زمین و آسمان کے مالک! اے یونس کو مچھلی کے پیٹ میں زندہ رکھنے والے، ابراہیم کو دہکتی آگ سے بچانے والے! تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وسیلہ بنا کر میری مدد فرما۔ آج میں تیری بارگاہ میں سچے دل سے توبہ کرتا ہوں سچے دل سے توبہ کرتا ہوں۔ سچے دل سے توبہ کرتا ہوں آخر کار میری آواز بڑبڑاہٹ میں تبدیل ہو گئی۔ شاید میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں اپنے بیڈ روم میں نرم و گداز بستر پر پڑا ہوا تھا۔ کمرے میں امی، سفینہ، نادیہ اور شاہ زیب کے علاوہ علی بابا بھی موجود تھے۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر نادیہ میرے ساتھ لپٹ کر رونے لگی اور امی نے فرط جذبات سے میرا ماتھا چومنا شروع کر دیا تھا۔ شاہ زیب اور سفینہ کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ میں نے ندامت بھرے انداز میں علی بابا کی طرف دیکھا اور پھر بے اختیار میری آنکھیں بھر آئیں۔

علی بابا کرسی سے اٹھ کر میرے بستر کے قریب آئے اور مشفقانہ لہجے میں بولے۔" جہانگیر احمد! اللہ تعالیٰ نے تمہیں نئی زندگی دی ہے۔ جس طرح تم نے سچے دل سے توبہ کی ہے

اسی طرح اس پر قائم بھی رہنا۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تمہیں ایسا وظیفہ بتا دوں گا کہ تمہاری ساری پریشانیاں دور ہو جائیں گی اور ہاں شاہ زیب جیسے سچے اور دل والے دوست مقدر سے ملا کرتے ہیں۔ اگر اس نے تمہاری حرکات پر نگاہیں نہ رکھیں ہوتی تو آج تم اس بستر پر موجود نہ ہوتے۔ لہٰذا شاہ زیب کی ہمیشہ قدر کرنا اور دیال چند جیسے مشرکوں سے ہمیشہ دور رہنا۔ کیونکہ کافر کبھی مومن کا دوست نہیں ہو سکتا۔''

اتنا کہہ کر علی بابا فوری ای کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ''بہن جی! جتنا جلدی ممکن ہو سکے آپ جہانگیر اور سفینہ کی شادی کروا دیں۔ اللہ نے چاہا تو یہ دونوں بڑی خوش و خرم زندگی گزاریں گے۔'' اس کے بعد علی بابا نے مجھے ایک وظیفہ بتایا اور اجازت لینے کے بعد شاہ زیب کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ آج میری شادی کو تین برس بیت چکے ہیں۔ میرا ایک پیارا بیٹا بھی ہے لیکن متحیر کن بات یہ ہے کہ اب مجھے کسی کے ساتھ بھی سفینہ کا ہنسنا بولنا برا نہیں لگتا۔ شاید یہ سب علی بابا کے بتائے گئے وظیفہ کی کرامت سے ہوا ہے۔



پُراسرار قتل

ایم ایس سی کرنے کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں درس و تدریس کی طرف مائل ہوتا لیکن اپنی فطری لاابالی اور سخت گیر طبیعت نے مجھے پولیس سروس جوائن کرنے پر اکسایا تو میں نے بغیر کسی کے علم میں لائے پولیس سروس جوائن کر لی یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمارے معاشرے میں محکمہ پولیس کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا اور اکثر لوگ پولیس سے کنی کترا کر گزرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے پولیس سروس جوائن کرنے والے اقدام پر گھر میں چند روز تو کہرام مچا رہا لیکن میں ہتھیار ڈالنے کی بجائے سختی کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ کیونکہ میں نے پولیس سروس جو عزم لے کر جوائن کی تھی اس کی اہمیت میری نگاہوں میں بہت بلند تھی۔ آخرکار گھر والوں کو میری ثابت قدمی نے چاروناچار یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور کر ہی دیا۔

میں آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ میرا تعلق ایک معزز اور امیر کبیر فیملی سے ہے۔ میرے والد صاحب پاک آرمی میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ مجھ سے بڑے ایک بھائی ہیں جو سندھ یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر ہیں اور ہم دونوں بھائیوں سے چھوٹی ایک بہن ہے جو مقامی کالج میں سال دوم کی طالبہ ہے ایسے میں میرا پولیس سروس جوائن کرنا اگر میرے گھر والوں کو ناگوار گزرا تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ ویسے بھی ان دنوں عروس البلاد کراچی آگ اور خون کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔ ڈائریکٹ اے ایس آئی بھرتی ہونے کے بعد جب میری ٹریننگ اختتام پذیر ہوئی تو میری پہلی تعیناتی ایک ایسے تھانے میں کی گئی جہاں ایس ایچ او سے لے کر ایک کانسٹیبل تک تمام اہلکار رشوت اور ناجائز اختیارات کا بے دریغ استعمال اپنا اولین فرض سمجھتے تھے۔

تھانے کا پورا عملہ اپنا بینک بیلنس بڑھانے کے لیے ظلم و بربریت اور اخلاق و تہذیب کی دھجیاں بکھیرنے والے دہشت گردوں کی پشت پناہی کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ یہ سب کچھ میرے جیسے شخص کی قوت برداشت سے باہر تھا۔ میں نے تو معاشرے کو جرائم اور دہشت گردی سے پاک کرنے کے لیے پولیس سروس جوائن کی تھی۔ ایس ایچ او صاحب نے مجھ ڈیوٹی کے پہلے دن ہی اس بات سے آگاہ کر دیا تھا کہ میں اپنے کام کام رکھوں زیادہ فرض شناسی دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ گویا اس نے مجھے دبے الفاظ یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ عوام کے جان و مال سے زیادہ ایک پولیس والے کی زندگی اہم ہے۔ شاید میرے خاندانی پس منظر کو دیکھتے ہوئے اس نے مجھ سے واشگاف الفاظ میں ایسی کوئی بات کہنے کی کوشش نہیں کی تھی جس سے میں یہ نتیجہ اخذ کر سکتا کہ وہ ایک بے ایمان اور بددیانت پولیس انسپکٹر ہے تاہم میں نے اس سے بحث کرنے سے گریز کیا تھا۔

☆☆☆

وہ میری ڈیوٹی کا غالباً پانچواں روز تھا۔ اس عرصے کے دوران میں تھانے کے عملے کی نفسیات سے کافی حد تک واقفیت حاصل کر چکا تھا۔ ایس ایچ او کی موجودگی کے دوران ان پانچ دنوں کے اندر ہمیں سماج دشمن عناصر کے خلاف متعدد بار چھاپے مارنے کے مواقع ملے تھے لیکن ایس ایچ او صاحب نے جان بوجھ کر کسی بھی موقع سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اپنے فرائض منصبی سے اس عدم توجہی دیکھ کر میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہتا تھا لیکن عملی طور پر مجھے ابھی تک کوئی بھی قدم اٹھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔

اس دن میں اپنی سیٹ پر بیٹھا ایک نامی گرامی مجرم کی فائل دیکھ رہا تھا۔ یہ مجرم بے شمار جرائم میں پولیس کو مطلوب تھا۔ قتل، ڈکیتی، بم بلاسٹ اور اغواء برائے تاوان جیسے بیسیوں سنگین کیسز میں۔ ایک عرصے سے پولیس کو اس کی تلاش تھی لیکن وہ آج تک نہیں پکڑا گیا تھا۔ منا بھائی نامی یہ مجرم یا تو بہت زیادہ ذہین اور چالاک تھا یا پھر پولیس کی نااہلی کی وجہ سے ابھی تک آزاد گھوم رہا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ فیڈرل بی ایریا میں دوکانداروں سے بزور اسلحہ بھتہ بھی وصول کیا کرتا تھا۔

دلاور صاحب کو کہیں گئے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ ہو گیا تھا۔ میں بدستور جرائم پیشہ افراد کی فائلیں کھنگالنے میں مصروف تھا کہ اچانک ٹیبل پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

تیسری گھنٹی ہونے پر میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

"ہیلو، پولیس اسٹیشن؟" مائیک سے ایک سہمی ہوئی آواز ابھری۔ شاید فون کرنے والا حد سے زیادہ گھبرا ہوا تھا۔

"یس۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"آپ کون بول رہے ہیں سر؟" اس نے دوبارہ سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"اے ایس آئی جواد حیدر"

"سر! مشہور دہشت گرد منا بھائی اس وقت گلشن کے علاقے میں ایک شاپنگ پلازہ میں مورچہ لگائے کھڑا ہوا ہے اور اس کے کارندے گن پوائنٹ پر دوکانداروں سے بھتہ وصول کر رہے ہیں۔ پلیز سر جلدی آ جائیے۔"

"او کے حوصلہ رکھیے ہم ابھی پہنچ رہے ہیں آج وہ بچ کر نہیں جائے گا" اتنا کہہ کر میں نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور جلدی سے اٹھ کر باہر کی طرف لپکا۔ تقریباً دس منٹ کے بعد میں چھ نوجوانوں کو ساتھ لے کر موبائل پر سوار تھانے سے باہر نکل رہا تھا مطلوبہ مقام پر پہنچنے کے لیے ہمیں بہت کم وقت لگا تھا۔ منا بھائی کو بھی ہمارے آنے کی خبر ہو گئی تھی اس لیے اس نے اپنے گرگوں کو ساتھ لے کر شاپنگ ایریا میں موجود گاڑیوں کو ڈھال بناتے ہوئے پولیس پر فائرنگ شروع کر دی۔ میرے حکم پر پولیس اہلکاروں نے بھی موبائل سے اتر کر پوزیشنیں سنبھالتے ہوئے جوابی فائرنگ شروع کر دی۔

پانچ دس منٹ کی فائرنگ کے بعد منا بھائی کا ایک آدمی جہنم واصل ہو گیا۔ اپنے ایک ساتھی کو گرتا دیکھ کر منا بھائی اور اس کے باقی تین ساتھی ایک گرے کلر کی پجیرو میں بیٹھے اور پولیس پر فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہو گئے۔ میں نے جوانوں کو دوبارہ موبائل پر بیٹھایا اور ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ اگرچہ دن دہاڑے پولیس اور دہشت گردوں کے درمیان فائرنگ دیکھ کر گلشن کے علاقے میں ایک خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ ٹریفک تقریباً رک گیا تھا مگر پھر بھی سڑک کے کنارے کافی گاڑیاں موجود تھیں۔

منا بھائی کا ڈرائیور بڑے ماہرانہ انداز میں پجیرو کو نیپا چورنگی سے یونیورسٹی روڈ اور وہاں سے حسن اسکوائر کی طرف نکال لے گیا۔ ہماری گاڑی بھی بدستور ان کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ دونوں طرف سے فائرنگ کا زبردست تبادلہ ہو رہا تھا۔ منا بھائی کی گاڑی سے کی جانے

والی فائرنگ سے چند ایک راہ گیر بھی زخمی ہو گئے تھے۔

کمشنر کلب کے نزدیک ریلوے کراسنگ پار کرنے کے بعد منا بھائی کی پجیرو جیسے ہی آگے بڑھی عزیز بھٹی پارک کی سمت سے آنے والی ایک بس یکا یک سامنے آ گئی۔ منا بھائی کے ڈرائیور نے تصادم سے بچنے کے لیے تیزی سے پجیرو کو دائیں طرف موڑا لیکن رفتار زیادہ ہونے کی وجہ سے ڈرائیور اسٹیرنگ پر قابو نہ رکھ سکا اور گاڑی سڑک کے عین وسط میں ایستادہ ٹریفک آئی لینڈ سے ٹکرا کر رک گئی۔ وہ چاروں حواس باختہ ہو کر پجیرو سے اترے اور بائیں طرف موجود ایک نالے کی طرف دوڑنے لگے۔ اسی اثناء میں ہماری موبائل وہاں پہنچ گئی۔ میں نے موبائل کے پوری طرح رکنے سے قبل ہی چھلانگ لگائی اور آٹو میٹک رائفل سے فائرنگ کرتا ہوا ان کے تعاقب میں دوڑا۔ دو جوان بھی میرے ساتھ موبائل سے کود کر دوڑے تھے۔

منا بھائی کا ایک ساتھی جمپ لگا کر چوڑا نالہ عبور کرنے کے بعد سامنے موجود ایک میدان کی چار دیواری کی طرف بھاگا وہ تقریباً دیوار کراس کرنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک کانسٹیبل کی گولی نے اسے دوبارہ نیچے لڑھکا دیا دوسری گولی نے اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دیا تھا۔

منا بھائی اور اس کے بقیہ دو ساتھی نالے میں چھلانگ لگانے کے بعد فائرنگ کرتے ہوئے گندے پانی میں دوڑتے ہوئے چلے گئے۔ میں بھاگ کر نالے کے قریب پہنچا اور پیٹ کے بل لیٹ کر پوزیشن لینے کے بعد فائر کھول دیا۔ ایک کانسٹیبل بھی دوڑ کر میری مدد کو پہنچ گیا تھا۔ ہم دونوں کی رائفلوں سے نکلنے والی گولیوں نے منا بھائی اور اس کے ساتھیوں کو ایک لمحے میں چھلنی کر کے رکھ دیا۔ گندگی کے ڈھیر گندے پانی میں ہی ڈھیر ہو چکے تھے۔

دوسرے روز اخبارات میں شہ سرخیوں کے ساتھ منا بھائی جیسے دہشت گرد اور اس کے ساتھیوں کی موت کی خبر شائع ہوئی تھی۔ دہشت گردوں کے علاوہ اخبارات نے میری تصویریں بھی شائع کی تھیں۔ اس کے علاوہ اخبارات میں عوامی حلقوں نے میری اس جرات کو بے تحاشہ سراہا تھا۔ منا بھائی کی موت نے مجھے ایک رات کے اندر عوامی ہیرو بنا دیا تھا لیکن دوسری طرف میں بعض اعلیٰ آفیسرز کے زیر عتاب بھی آ گیا تھا۔ سب سے پہلے تو میرے تھانے کا انچارج ایس ایچ او مجھ پر چڑھ دوڑا۔

''تم نے کس کے حکم پر منا بھائی کے خلاف اتنا بڑا قدم اٹھانے کی جرات کی تھی۔''

''سر آپ کا مطلب ہے کہ دہشت گردوں اور قاتلوں کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے کسی سے پرمیشن لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔؟''

''میں منا بھائی کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ چلا کر بولا۔

''منا بھائی کسی مسجد کا امام نہیں تھا سر۔ وہ ایک دہشت گرد تھا اور ہر دہشت گرد کا انجام یہی ہوتا ہے۔''

''میں اپنے علاقے کو پر سکون دیکھنا چاہتا ہوں۔'' دلاور صاحب نے مجھے گھورا اور جانے کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

چند دنوں کے بعد دلاور صاحب نے مجھے دفتر میں بلوایا اور ٹرانسفر آرڈر میرے ہاتھ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''جو وحید ور۔ میں نے تمہارے ٹرانسفر کرانے کے لیے بہت زیادہ بھاگ دوڑ کی ہے۔ اعلیٰ حکام کو تمہاری ترقی کے لیے لیٹر بھی لکھا تھا جس کا جواب آج آ گیا ہے۔ تمہیں ایس ایچ او بنا کر یہاں سے گوٹھ مراد تھانے میں ٹرانسفر کر دیا گیا ہے۔ جانے کی تیاری کرو۔''

''تھینک یو ویری مچ سر۔'' میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''میں آپ کی اس عنایت کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔ یہ تو میری دلی خواہش تھی کہ مجھے کسی تھانے کا انچارج بنا دیا جائے تاکہ مجھے مجرموں کے خلاف کارروائی کرتے وقت کسی سے پرمیشن نہ لینا پڑے۔'' میرا جواب سن کر اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا شاید اسے میری دماغی حالت پر کسی قسم کا شبہ ہو گیا تھا تاہم میں اسے بولنے کا موقع دیئے بغیر دفتر سے باہر نکل آیا۔

تھانہ گوٹھ مراد صرف کہنے کی حد تک تھانہ تھا ورنہ اس کی حالت دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ تھانے کی بجائے کسی وڈیرے کا ڈیرہ ہو۔ تھانے کا ماحول ٹھیک کرنے کے لیے مجھے بے تحاشہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ پہلے پہل تو گوٹھ مراد کے کرتا دھرتا وڈیرا سانول نے مجھے اپنی مرضی پر چلانے کے لیے بڑا رعب داب دکھایا۔ دھمکانے تک کی کوشش کی لیکن جب اسے میرے خاندانی پس منظر کا پتہ چلا تو اس نے بھیڑیئے کا چولا اتار کر لومڑی کی کھال اوڑھ لی لیکن مجھے رجھانے میں پھر بھی ناکام رہا تھا۔ میں نے اس سے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ ''وڈیرا سانول'' میں قانون کا محافظ ہوں مجھے یہاں سرکار نے عوام الناس کی عزت و جان کی

حفاظت کرنے کے لیے بھیجا ہے نہ کہ کسی وڈیرے کی چاکری کے لیے۔ میرے لیے اس گوٹھ کا ایک عام آدمی بھی اتنا ہی قابل احترام ہے جتنے آپ ہیں۔ اس لیے براہ کرام میرے کسی کام میں مداخلت مت کرنا۔ ورنہ آپ نہ صرف میرے بلکہ قانون کے بھی مجرم کہلائیں گے۔ البتہ کسی سرکاری کام کے لیے آپ دن ہو یا رات کسی بھی وقت طلب کر سکتے ہیں۔ میں یہاں آپ لوگوں کی خدمت ہی کے لیے تو آیا ہوں۔

وڈیرا سانول میرے تیور دیکھ کر تو بچ بچ سنبھل گیا یا پھر اس نے وقتی طور پر چپ سادھ لی تھی۔

قصبہ گوٹھ مراد یوں تو بڑا خوبصورت علاقہ تھا پرسکون اور جاذب نگاہ مگر قصبے کے مغربی جانب ایک گنجان جنگل دور تک پھیلا ہوا تھا جس میں ڈاکوؤں کے ساتھ ساتھ جنگلی درندوں کے بھی پائے جانے کے امکانات تھے۔ تھانے کا عملہ جو میرے آنے سے قبل سستی میں اپنی مثال آپ تھا کافی حد تک سدھر چکا تھا۔ انہیں میری سخت گیر طبیعت اور اصول پسندی کا اندازہ بخوبی ہو گیا تھا اس لیے وہ اب وڈیرا سانول سے زیادہ میرے احکام پر توجہ دیتے تھے۔ یوں تو تھانے کا تمام عملہ میرے ساتھ چند دنوں کے اندر گھل مل گیا سوائے اے ایس آئی فرحان علی اپنے کام سے کام رکھنے والا۔ میں نے اسے کبھی کھل کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک عجیب سی پراسراریت رچی ہوئی تھی۔ اس کے طور طریقے پولیس والوں سے الگ تھلگ تھے کبھی کبھی وہ بالکل کسی روبوٹ کی طرح لگتا تھا۔ ایسے جیسے اس کے ہر عمل کے پیچھے کسی ان دیکھی طاقت کا ہاتھ ہو۔ یوں تو وہ ہر وقت کھویا کھویا رہتا تھا لیکن کبھی کبھار اس کی سیاہ آنکھوں سے جھلکتی وحشت دیکھ کر عام دل گردے کا آدمی خوفزدہ سا ہو جایا کرتا تھا لیکن ایک بات تھی جسے سوچ کر میں نے اسے کریدنا نامناسب خیال کیا تھا وہ تھی اس کی فرض شناسی ۔ وہ اپنے فرائض منصبی بڑی دیانتداری کے ساتھ سرانجام دیتا تھا۔

گوٹھ مراد میں ڈیوٹی سنبھالے مجھے دو ماہ ہو چکے تھے۔ اس دوران تھانے میں کوئی اہم کیس نہیں آیا تھا۔ البتہ اکا دکا لڑائی جھگڑوں کے کیس آتے رہتے تھے جنہیں میں بڑی خوبی کے ساتھ نمٹا دیا کرتا تھا۔ اس روز صبح سویرے ہی میں ابھی ناشتے سے فارغ ہوا تھا کہ مجھے تھانے کے احاطے میں شور سنائی دیا۔ میری ایک عادت تھی کہ میں ناشتہ ہمیشہ یونیفارم پہن کر کیا کرتا تھا اس لیے مجھے باہر آنے میں دیر نہ لگی۔

تھانے کے احاطے میں لگ بھگ پندرہ بیس افراد موجود تھے جو ڈیوٹی پر تعینات کانسٹیبل داون خان سے میرے متعلق معلوم کر رہے تھے۔ ان افراد میں وڈیرا سانول بھی نمایاں طور پر نظر آ رہا تھا۔

”داون خان! یہ تھانے میں میلہ کیوں لگا رکھا ہے؟“ میں نے اونچی آواز میں اس سے پوچھا۔

”سر جی۔ وہ مٹھن اپنے گھر میں آج صبح مردہ پایا گیا پر اسے کسی آدمی نے قتل نہیں کیا ہے اور نہ ہی وہ طبعی موت مرا ہے۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو کیا اسے کسی جن بھوت نے ہلاک کیا ہے یا پھر اس نے خودکشی کر لی ہے؟“ میں نے جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

”مجھ سے پوچھیے تھانیدار سائیں۔“ وڈیرا سانول نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ ”مٹھن میرا خاص آدمی تھا بڑا جی دار شخص تھا لیکن کل رات اسے کسی خونخوار درندے نے ہلاک کر ڈالا ہے۔ آپ چل کر لاش کا معائنہ کر لیں۔ ویسے مجھے تو سو فیصد کسی جنگلی درندے کا کام لگتا ہے مگر آپ کو قانونی کارروائی پوری کرنے کے لیے لاش کا جائزہ تو لینا ہی پڑے گا۔“

”چلیے۔“ میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل اور اے ایس آئی فرحان علی کو ساتھ لیا اور وڈیرا سانول کے ساتھ موقعہ واردات کی طرف روانہ ہو گیا۔ قصبے کی نیم پختہ و کشادہ گلیوں میں سے گزرتے ہوئے ہم دس منٹ کے اندر جائے واردات پر پہنچ گئے۔ مٹھن کا گھر وڈیرے سانول کی وسیع و عریض پختہ حویلی سے لگ بھگ پچاس گز کے فاصلے پر واقع تھا۔

کچی اینٹوں اور گارے سے بنا یہ گھر تین کمروں پر مشتمل تھا۔ بیرونی دروازے سے گزر کر ہم لوگ مکان کے صحن میں پہنچے تو میں نے وڈیرا سانول کے علاوہ باقی لوگوں کو کمرے کے اندر داخل ہونے سے منع کر دیا۔

”لاش کون سے کمرے میں پڑی ہوئی ہے؟“

میں نے وڈیرا سانول سے پوچھا۔

”درمیانے والے کمرے میں سائیں۔ آیئے میں آپ کو دکھا دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وڈیرے سانول نے ہمیں آگے بڑھنے کا اشارہ کر دیا۔

سب سے پہلے میں نے ہی کمرے کے اندر قدم رکھا تھا۔ میرے بعد اے ایس آئی فرحان علی، وڈیرا سانول اور ہیڈ کانسٹیبل بھی اندر آ گئے تھے۔ بان کی بنی ہوئی ایک بے ڈھنگی سی چارپائی کے پاس کچے فرش پر مشعن کی لاش جس پوزیشن میں پڑی ہوئی تھی اسے دیکھ کر فطرتاً نڈر ہونے کے باوجود میرے بدن میں خوف کی ایک سرد لہر سرایت کر گئی۔ مجھے اپنے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ کمرے کی اونچی دیواروں اور فرش پر بھی خون کے چھینٹے نظر آ رہے تھے میں نے غور سے لاش کا معائنہ کیا اور ایک جھرجھری لے کر رہ گیا۔

لاش کا نرخرہ مکمل طور پر ادھڑا ہوا تھا۔ چہرے اور باقی بدن پر بھی واضح طور پر خونخوار درندے کے پنجوں اور دانتوں کے نشان ثبت تھے۔ لاش کی دونوں آنکھیں چھوٹے چھوٹے سیاہ گڑھوں کی مانند نظر آ رہی تھیں۔ شاید درندے نے پنجے مار کر انہیں پھوڑ دیا تھا۔ مجموعی طور پر لاش کے ساتھ جس بربریت کا مظاہرہ کیا گیا تھا وہ ظاہری طور پر واقعی کسی درندے کی کارستانی لگتی تھی لیکن مجھے جس بات نے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا وہ یہ تھا کہ آخر خونخوار درندے نے لاش کا کوئی حصہ کھایا کیوں نہیں تھا؟ عموماً ہوتا ایسا ہے کہ جس درندے کے منہ کو انسانی خون لگ جائے وہ سالم لاش چھوڑ کر کبھی نہیں جاتا لاش کا کچھ حصہ ضرور کھا جاتا ہے تو کیا اس کا مقصد مشعن کو ہلاک کرنا تھا؟ دوسری بات یہ تھی کہ مجھے کمرے کے کچے فرش پر کہیں بھی درندے کے قدموں کے نشان نظر نہیں آئے یا پھر مجھ سے پہلے آنے والے آدمیوں کی آمد و رفت نے کمرے کے فرش سے وہ نشان ضائع کر دیئے تھے اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو یہ میری تفتیش کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ پیدا کرنے والی بات تھی۔

اچانک ایک خیال برق کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا اور میں نے وڈیرے سانول سے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''وڈیرا سائیں! یہاں گوٹھ مراد میں کسی کے پاس سدھایا ہوا کتا ہے؟''

''نہیں جناب۔ جہاں تک میری معلومات ہیں اس قصبے میں شاید ہی کسی کے پاس ایسا کتا ہو۔ ویسے مجھے تو یہ کسی سدھائے کتے کا کام نہیں لگتا بہرحال آپ مجھ سے بہتر انداز میں سوچ سکتے ہیں۔ آپ ایک پولیس انسپکٹر ہیں اور میں ٹھہرا گاؤں کا ایک وڈیرا۔'' اس نے سیدھا سادہ جواب دیا۔

''اچھا یہ بتایئے اس سے پیشتر بھی کبھی ایسا واقعہ پیش آیا ہے'' میں نے دوبارہ

پوچھا۔

''جی ہاں جناب! بالکل اسی طرح کا سانحہ آپ کے یہاں آنے سے تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل میرے ایک اور خاص آدمی کے ساتھ پیش آ چکا ہے۔''

''کیا نام تھا اس شخص کا؟''

''فضل دادا جناب''

''وڈیرا سانول! کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ دونوں بار یہ خونچکاں واقعہ آپ کے ہی آدمیوں کے ساتھ پیش آیا ہے کیا یہ محض اتفاق یا پھر؟ میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر جواب طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب! میری تو خود سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا'' وہ گڑبڑا کر بولا۔

میں نے وڈیرا سانول سے چند ایک سوال اور پوچھے اور پھر اے ایس آئی فرحان علی سے مخاطب ہو کر کہا'' فرحان علی میں واپس تھانے جا رہا ہوں۔ تم ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد لاش دفنانے کے لیے ورثاء کے حوالے کر دینا مجھے واقعی یہ کسی جنگلی درندے کا کام معلوم ہوتا ہے۔''

''بالکل جناب! یہ لاش کی حالت دیکھ کر ہی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کام کسی انسان کے بس کا نہیں ہے'' میں نے اسے پہلی بار خوش کن انداز میں بولتے ہوئے دیکھا تھا حالانکہ وہ کسی طرح بھی خوشی کے اظہار کا موقع نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے مشعن کی ہلاکت پر بڑی مسرت ہوئی ہے۔ یہ بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی لیکن اسے میں نے اس بات کا قطعی احساس نہ ہونے دیا۔ نجانے میری چھٹی حس مجھے بار بار یہ احساس کیوں دلا رہی تھی کہ اے ایس آئی فرحان علی جیسا نظر آتا ہے حقیقتاً ویسا نہیں ہے۔

☆☆☆

دوسرے روز میں نے اے ایس آئی فرحان علی کو دفتر میں بلا کر مختلف حربوں سے کریدنے کی کوشش کی مگر کوئی ایک بات بھی کام کی معلوم نہ کر سکا۔ میں نے اس سے وڈیرا سانول کے بارے میں بھی مختلف قسم کے سوال پوچھے مگر اس نے وڈیرا سانول کو بالکل ایک شریف النفس شخص قرار دے دیا تھا۔

اے ایس آئی فرمان علی سے ناامید ہونے کے بعد میں نے وڈیرا سانول سے رجوع کیا مگر اس سے بھی کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ البتہ میرے کیے گئے بعض سوالوں سے وہ گڑبڑا ضرور گیا تھا جس سے میرا یقین اور پختہ ہو گیا۔ اب اے ایس آئی فرمان علی سے زیادہ مجھے وڈیرا سانول اس معاملے میں ملوث نظر آ رہا تھا۔

میں اپنے ہی خیالات میں گم بیٹھا تھا کہ اچانک ایک کانسٹیبل اندر داخل ہوا اور سیلوٹ مارنے کے بعد بولا۔ ''سر! وڈیرا سانول آیا ہے اور فوری طور پر آپ سے ملنا چاہتا ہے''

''ہاں ٹھیک ہے اسے اندر بھیج دیجئے'' ایک لمحہ بعد وڈیرا سانول اندر داخل ہوا گھبراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''تھانیدار سائیں! خدا کے لیے میری مدد کیجئے ورنہ۔ وہ۔ وہ مجھے مار ڈالے گی۔ جیسے اس نے فضل داد اور مٹھن کو مارا ہے'' وہ اٹک اٹک کر بول رہا تھا اور اس قدر خوفزدہ اور سہما ہوا لگ رہا تھا کہ چہرے کی تروتازگی نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد بڑے سیاہ حلقے اس کے رت جگوں کی داستان سنا رہے تھے اور وڈیرانہ شان و شوکت ہوا ہو چکی تھی۔

''وہ کون وڈیرا سائیں؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''وہی۔ وہی جس نے فضل داد اور مٹھن کو اتنی بے رحمی کے ساتھ ہلاک کیا ہے۔'' وہ بدستور سہما ہوا تھا میں نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے کانسٹیبل کو بلا کر ٹھنڈا پانی منگوایا اور گلاس بھر کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ''سائیں آرام سے بیٹھے۔ پہلے پانی پی لیں اور پھر مجھے کھل کر ساری بات بتائیے۔ خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں آپ کی پوری مدد کروں گا۔ وہ چاہے کوئی بھی ہے قانون سے زیادہ طاقتور نہیں ہو سکتا۔'' اس نے میرے ہاتھ سے گلاس لے کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ اب وہ قدرے پرسکون نظر آ رہا تھا۔ شاید یہ میری باتوں یا پھر ٹھنڈے پانی کی تاثیر تھی کہ رفتہ رفتہ اس نے اپنی خوفزدہ حالت پر قابو پا لیا۔

''وہ۔ صدف کی روح ہے۔ فضل داد اور مٹھن کے بعد اب وہ مجھے بھی انہی کی طرح ہلاک کرنا چاہتی ہے۔ خدا کے لیے سائیں میری مدد کیجئے۔ یہ دیکھیے اس روح کی دیدہ دلیری۔ یہ تینوں رقعے یکے بعد دیگرے مجھے اپنی خواب گاہ سے ملے ہیں۔'' اس نے میرے سامنے ٹیبل پر کاغذ کے تین ٹکڑے رکھتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے کاغذ کے وہ تینوں ٹکڑے بغور دیکھے ہر ٹکڑے پر ایک ہی ہاتھ کی تحریر تھی اور

عبارت بھی یکساں تھی۔ ''وڈیرا سانول! مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تمہارا انجام بھی فضل داد اور مٹھن کی طرح ہوگا۔ بہت جلد تم بھی انہی کے پاس پہنچ جاؤ گے۔''

صدف کی روح اول تو ایسی باتوں پر میں سرے سے یقین ہی نہیں کرتا تھا۔ میرا ایمان تھا کہ دنیا سے رخصت ہو جانے والے کسی بھی شخص کی روح دوبارہ کسی شکل میں واپس نہیں آ سکتی۔ بالفرض محال اگر یہ بات تسلیم کر بھی لی جائے تو پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ کوئی روح بذریعہ خط اپنے قاتل کو دھمکی بھی دے سکتی ہے۔ میں جتنا اس معاملے پر غور کرتا جا رہا تھا توں توں یہ معاملہ میری سمجھ میں آتا جا رہا تھا مجھے اس ساری کارروائی کے پیچھے کوئی بہت ہی ذہین قسم کا مجرم کام کرتا نظر آ رہا تھا۔

''میں نے سوال کیا۔ سائیں یہ صدف کون تھی؟ کیا اس کی گوٹھ کی رہنے والی تھی؟''۔

''نہیں جناب شہر کی رہنے والی تھی۔''

''ایک شہری لڑکی اس گوٹھ میں کیا لینے آئی تھی؟ میں اس کی پوری کہانی سننا چاہتا ہوں'' میں نے دوبارہ سوال کیا۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ شش و پنج کا شکار ہو گیا میں اس کے چہرے سے بخوبی یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کس کرب سے گزر رہا ہے ایک طرف تو اسے اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اور دوسری طرف اسے اپنی زبان سے اپنا راز افشاں کرنا پڑ رہا تھا تاہم تھوڑی دیر سوچنے کے بعد وہ بولا۔

''جناب۔ صدف نامی وہ لڑکی کراچی شہر کی رہنے والی تھی۔ بیچاری کسی اخبار کے دفتر میں ملازمت کرتی تھی تقریباً ایک سال قبل وہ گوٹھ مراد کسی دفتری کام کے سلسلے میں آئی تھی شاید وہ گوٹھ مراد سے ملحق جنگل میں موجود ڈاکوؤں پر کچھ لکھنا چاہتی تھی لیکن بدقسمتی سے وہ ان درندہ صفت ڈاکوؤں کے ہاتھ لگ گئی اور بیچاری اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔''

''وڈیرا سائیں۔ صدف نامی وہ لڑکی گوٹھ مراد میں کتنے دن رہی تھی؟ اور کس کے ہاں ٹھہری تھی؟'' میں نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

''بولیے سائیں بولیے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے قانون آپ کے ساتھ ہے۔'' اسے بوکھلاتے دیکھ کر میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''جناب۔ وہ۔ میری ہی حویلی میں ٹھہری تھی اور تقریباً دس روز تک ہماری مہمان

رہی تھی۔ دسویں روز نجانے واردات کے کس پہر حویلی سے باہر نکلی۔ صبح ہمیں مغربی جنگل کے قریب اس کی بریدہ لاش ملی تھی۔''

''کیا لاش کا پوسٹمارٹم کیا گیا تھا؟'' میں نے وڈیرا سانول کے خاموش ہوتے ہی سوال کیا۔

''جی ہاں، جناب! آپ سے پہلے جو اس تھانے کا انچارج تھا اس نے اس معاملے کی پوری چھان بین کی تھی صدف کو واقعی ڈاکوؤں نے ہلاک کیا تھا۔ اس کی موت کا ریکارڈ تھانے میں موجود ہوگا آپ بے شک چیک کرلیں''۔

''ٹھیک ہے وڈیرا سانول اب آپ بے خوف ہو کر اپنے گھر جائیں۔ دن کے وقت تو ویسے بھی آپ کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہوسکتا البتہ رات کے وقت میں آپ کی سیکورٹی کا مناسب انتظام کردوں گا۔''

''وڈیرا سانول میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہوگیا اور میں دوبارہ سوچ وبچار میں مصروف ہوگیا۔ اس معاملے کو سلجھانے کے لیے صدف کے قتل کی انکوائری فائل منگوا کر بغور اس کا مطالعہ کیا۔ فائل کے مطابق صدف بائیس سال کی غیر شادی شدہ لڑکی تھی ماں باپ فوت ہوچکے تھے صرف ایک بڑا بھائی تھا جس کے متعلق فائل میں کوئی خاص معلومات نہیں دی گئی تھیں وہ کراچی کے ایک روزنامے میں رپورٹر کی جاب کررہی تھی۔ گویا مراد میں وہ واقعی ڈاکوؤں کے ہاتھوں ہلاک ہوگئی تھی۔ اس کی لاش لینے کے لیے اس کے دفتر کا عملہ آیا تھا۔ فائل میں اس کے ورثاء کے متعلق کسی قسم کی تفصیل دینے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی تھی حتیٰ کہ اس کے اکلوتے بھائی کا نام تک نہیں دیا گیا تھا۔ وہ کورنگی ٹاؤن کی رہائشی تھی۔ فائل میں میرے لیے قابل ذکر بات یہی تھی کہ صدف کا ایک بھائی بھی تھا۔ اب مجھے اس کے بھائی کا کھوج لگانا تھا اور اس مقصد کے لیے میرا کورنگی ٹاؤن جانا ضروری ہوگیا تھا۔

اس کے علاوہ وڈیرا سانول کی سیکورٹی کا معقول انتظام کرنا بھی ضروری تھا لہٰذا سب سے پہلے میں نے سینئر کانسٹیبل سیف الرحمان زلفی کو بلا کر اس بارے میں سمجھایا اور دو کانسٹیبل اس کی کمانڈ میں دے کر اسے وڈیرے سانول کی حویلی کی طرف روانہ کردیا۔ کانسٹیبل زلفی کی فرض شناسی تعارف کی محتاج نہیں تھی۔

☆☆☆

چار دن بخیریت گزر گئے تھے۔ اس دوران کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں ہوا تھا۔ کانسٹیبل زلفی اپنے دونوں ساتھیوں سمیت بڑی دیانتداری کے ساتھ ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔ وڈیرا سانول کا خوف کافی حد تک کم ہوچکا تھا کیونکہ اس عرصے کے دوران اسے قاتل روح کی طرف سے کسی قسم کا بھی دھمکی آمیز پیغام نہیں ملا تھا۔ شاید قاتل جو کوئی بھی تھا ہوشیار ہوچکا تھا۔

میں نے کورنگی ٹاؤن جاکر صدف کے بھائی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے بڑی بھاگ دوڑ کی تھی لیکن ناکام رہا تھا۔ مجھے صرف اتنا علم ہوسکا کہ صدف کا ایک بڑا بھائی ہے جس کا نام رابعہ ہے وہ کہاں رہتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ اس کا پورا نام کیا ہے؟ میرے ان سوالات کا جواب کوئی بھی نہیں دے سکا تھا یا پھر کسی مصلحت کے تحت جان بوجھ کر نہیں دیا گیا تھا۔

قاتل تک پہنچنے کے لیے اب میرے پاس یہی ایک ذریعہ رہ گیا تھا کہ میں وڈیرا سانول کے اردگرد چوری چھپے منڈلاتا رہوں کیونکہ اس کا اگلا شکار وڈیرا سانول ہی تھا اگرچہ کانسٹیبل سیف الرحمان زلفی اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ بلاناغہ رات کے وقت وڈیرا سانول کی حویلی میں موجود رہتا تھا لیکن میں پھر بھی کبھی کبھار نصف شب کو یا رات کے پچھلے پہر انہیں چیک ضرور کیا کرتا تھا۔ میں اس معاملے میں غفلت برت کر قاتل کو کسی قسم کا موقع فراہم نہیں کرنا چاہتا تھا۔

قاتل چاہے کوئی بھٹکی روح تھی یا کوئی خونخوار درندہ یا پھر کوئی بہت ہی چالاک انسان تھا میری نگاہوں سے بچ کر وڈیرے سانول تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ایمرجنسی کی صورت میں میں نے کانسٹیبل زلفی سے کہہ رکھا تھا کہ رات کے چاہے جس وقت بھی اسے ضرورت پڑے بلا خوف مجھے فون کرسکتا ہے۔

اس دن غالباً منگل تھا۔ میں سارا دن تھانے میں مصروف رہا تھا۔ شام سے تھوڑی دیر قبل میں نے یونیفارم اتاری اور باتھ روم میں گھس گیا۔ سردیوں کے دن تھے اس لیے گرم پانی سے غسل کرنے کے بعد میری تھکاوٹ کافی حد تک کم ہوگئی تھی۔

اپنے لیے ایک کپ گرماگرم کافی تیار کرنے کے بعد میں نے ایک معلوماتی کتاب اٹھائی اور لحاف میں گھس گیا۔ کتاب کے مطالعے کے ساتھ ساتھ کافی نے لطف دوبالا کردیا تھا۔ کپ خالی ہونے کے بعد میں نے اسے ساتھ والی میز پر رکھ دیا۔ کتاب اس قدر دلچسپ تھی کہ

مجھے وقت گزرنے کا پتہ بھی نہ چل سکا۔ اچانک باہر بادل کی گرج سنائی دی اور میری نگاہیں خودکار انداز میں کمرے کی کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ اگرچہ کھڑکی بند تھی مگر شفاف شیشے سے باہر کا منظر نظر آ رہا تھا کیونکہ برآمدے میں موجود سیکورٹی لائٹ آن تھی۔ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ وقفے وقفے سے بجلی چمک رہی تھی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد ایک بار پھر میں کتاب کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ بارش بدستور جاری تھی۔ جوں جوں رات کی تاریکی بڑھ رہی تھی ماحول کی پراسراریت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ تھانے میں اعصاب کو جھنجوڑ دینے والا سکوت طاری تھا۔ ویسے بھی تھانہ قصبے سے ذرا الگ تھلگ واقع تھا تاہم قصبے کی طرف سے کبھی کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی بھٹکی ہوئی بدروح قصبے کی گلیوں میں انسانی خون کی تلاش میں گھوم رہی ہو۔

رات کے تقریباً بارہ بجے کانسٹیبل دارن خان کی ڈیوٹی آف ہوئی اس وقت تک بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا تاہم ہلکی پھلکی پھوار بدستور پڑ رہی تھی۔ یکدم ایک خیال برف کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا۔ کہ آج کی رات قاتل کے لیے اپنا کام انجام دینے کے لیے نہایت سہل ہو سکتی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میرے پورے وجود میں سنسنی دوڑ گئی اور میری چھٹی حس پکار پکار کر مجھے آنے والے خطرات سے آگاہ کرنے لگی۔

''انسپکٹر جواد حیدر آج کچھ ہونے والا ہے آج کچھ ہونے والا ہے۔''

میں نے ڈیوٹی پر آنے والے نئے کانسٹیبل کو الرٹ رہنے کا حکم دیا اور خود بغیر یونیفارم کے صرف سروس ریوالور لے کر تھانے سے باہر نکل آیا۔ ابھی میں نے تھانے کا مین گیٹ ہی کراس کیا تھا کہ اچانک مجھے عقب سے ڈیوٹی پر موجود کانسٹیبل کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''سر! جلدی آیئے کانسٹیبل سیف الرحمان زلفی کا فون ہے۔''

کانسٹیبل زلفی کا نام سن کر میرے ذہن میں خطرات کا الارم بجنے لگا۔ میں دوڑ کر ٹیلی فون کے پاس پہنچا اور ریسیور کانسٹیبل کے ہاتھ سے لے کر کان سے لگا دیا۔ ''ہاں زلفی کیا خبر ہے خیریت تو ہے ناں؟'' میں نے ریسیور ہاتھ میں لیتے ہوئے سوالیہ انداز میں پوچھا۔''
سس۔سر۔جل۔جلدی کریں وڈیرا سانول کی زندگی۔ خط۔ خطرے میں ہے۔''
شدت خوف سے کانسٹیبل زلفی کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔'' زلفی حوصلہ رکھیے میں فوراً

پہنچتا ہوں۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے پوری بات بتایئے۔'' میں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے جواباً کہا۔

''سر پلیز فون پر باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں خود بھی زخمی ہوں اور میرے دونوں ساتھیوں کو بھی بے ہوش کر دیا ہے۔ وہ واقعی ایک خونخوار درندہ ہے۔ اس کی شکل دیکھ کر آدمی دہل جاتا ہے۔ وہ۔ وہ وڈیرے کی خوابگاہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔'' کانسٹیبل زلفی نے ہذیانی انداز میں چلا کر کہا اور میں نے ریسیور کریڈل پر پٹخا اور دیوانہ وار سانول کی حویلی کی طرف دوڑ لگا دی۔ گلیوں میں باوجود بارش کے پانی اور کیچڑ نے میرا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا مگر مجھے اس کی پرواہ کب تھی دو بار تو میں گرتے گرتے بچا تھا۔ اگر مجھے اس وقت کوئی شخص دیکھ لیتا تو مارے خوف کے بے ہوش ہو جاتا۔ رات کی تاریکی اور سناٹے میں مجھ پر کسی بھوت کا گمان ہو رہا تھا۔

تقریباً دس منٹ کی دوڑ میں وڈیرا سانوال کی حویلی میں پہنچا تو وہاں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں نے کانسٹیبل زلفی کو آواز دی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ اچانک حویلی میں ایک دردناک چیخ گونجی اور رات کے پر ہول سناٹے کو مرتعش کرتی ہوئی فضاء میں معدوم ہو گئی۔ میں ایک جھرجھری لے کر رہ گیا۔ میرے دل کی دھڑکن معمول سے کچھ زیادہ تیز ہو گئی تھی۔

چیخ کی آواز حویلی کی اوپری منزل سے آئی تھی۔ میں بھاگ کر برآمدے میں پہنچا اور ریوالور نکال کر دائیں طرف موجود سیڑھیاں پھلانگتا چلا گیا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر بائیں ہاتھ پر مجھے ایک کمرے میں روشنی نظر آنے لگی۔ میں دوڑ کر کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ ابھی میں نے دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ دوبارہ وہی کربناک چیخ بلند ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے تو میرا وجود لرز کر رہ گیا اور میرے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے مگر پھر خود پر قابو پا کر میں نے زور زور سے دروازے کو دھڑ دھڑانا شروع کر دیا۔ ''وڈیرا سانوال! دروازہ کھولیے۔ دروازہ کھولیے۔ میں انسپکٹر جواد حیدر ہوں۔'' میں نے چلا کر کہا۔

''اگر زندگی پیاری ہے تو بھاگ جاؤ انسپکٹر ورنہ اس پاپی کے ساتھ ساتھ تمہارے بھی ٹکڑے کر دوں گا۔''

اندر سے ایک غراہٹ نما آواز ابھری۔

''دیکھو تم جو کوئی بھی ہو شرافت سے دروازہ کھول کر اپنے آپ کو قانون کے حوالے

کردو۔تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔"

میں نے بارعب لہجے میں جواب دیا مگر اندر سے میری باتوں کا جواب آنے کی بجائے وڈیرا سانول کی دردناک چیخوں کے ساتھ غراہٹ نما آوازیں آنے لگیں۔یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی خونخوار درندہ وڈیرا سانول کو بڑی بے رحمی کے ساتھ بھنبھوڑ رہا ہو۔وڈیرا سانول کی چیخ سن کر ایک لمحے کے لیے تو مجھ پر جنون سا طاری ہوگیا میں نے زور زور سے دروازے پر کندھا مارنا شروع کردیا مگر یہ میری بھول تھی دروازہ بہت مضبوط تھا۔انتہائی کوشش کے باوجود میں اسے نہ اکھاڑ سکا۔

اچانک میں نے دروازے کو چھوڑ دیا اور دائیں طرف موجود کمرے کی اکلوتی کھڑکی کی طرف لپکا۔خوش قسمتی سے کھڑکی میں گرل لگی ہوئی نہیں تھی صرف شیشے تھے مگر وہ بھی ڈارک جن سے اندر کا منظر نظر نہیں آرہا تھا۔میں نے دیوارانہ وار ریوالور کا دستہ استعمال کرتے ہوئے کھڑکی کے تمام شیشے توڑ ڈالے۔دوسرے لمحے میں کھڑکی کی چٹخنی کھول کر اندر کود چکا تھا۔

اندر کا منظر دیکھ کر انتہائی نڈر ہونے کے باوجود مجھ پر لرزہ طاری ہوگیا۔وہ کوئی عفریت تھا جس نے وڈیرہ سانول کو بری طرح نرغے میں لے رکھا تھا اس کے نیچے وڈیرا سانول ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح تڑپ رہا تھا۔میں نے ریوالور کو مضبوطی سے پکڑا اور لہجے کو حتی الوسیع بارعب بنا کر بولا۔"چھوڑ دو وڈیرے کو ورنہ میں گولی چلادوں گا۔" مگر اس پر میری بات کا مطلق اثر نہ ہوا وہ بدستور وڈیرے کو بھنبھوڑنے میں لگا رہا۔میں نے طیش میں آکر اس کی ٹانگ کا نشانہ لے کر گولی چلادی۔دھائیں کی آواز کے ساتھ ہی اس کے منہ سے ایک غراہٹ آمیز صدا بلند ہوئی اور وہ وڈیرے کو چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

جونہی میں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی ریوالور میرے ہاتھوں میں کانپنے لگا۔ میں نے اپنی زندگی میں اس قدر بھیانک اور ڈراؤنا چہرہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔وہ سچ مچ کوئی انسانی خون پینے والا ڈریکولا ہی تھا۔اس کے لبوں سے سرخ خون ٹپک رہا تھا اور اس کے سیاہ پنجے اگرچہ انسانی ہاتھوں سے مشابہ تھے مگر ناخن بالکل کسی خونخوار درندے کے ناخنوں کی طرح نوکیلے اور لمبے تھے۔اس کے دونوں پنجے بھی خون سے لتھڑے ہوئے تھے۔سرد موسم ہونے کے باوجود میرے ماتھے پر پسینے کے قطرے رینگنے لگے۔

"رک۔رک۔جاؤ۔ورنہ۔میں۔گولی۔؟" اسے آگے بڑھتا دیکھ کر میں شدت

خوف سے بول نہیں پارہا تھا۔وہ بدمست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا لمحہ بہ لمحہ میرے نزدیک آتا جارہا تھا۔قریب تھا کہ وہ مجھے پکڑ لیتا مگر اچانک غیر ارادی طور پر ریوالور میرے ہاتھوں میں سیدھا ہوا اور پھر یکے بعد دیگرے کمرے میں دھائیں دھائیں کی آواز گونج اٹھی۔پہلی تین گولیاں اس کے سینے میں لگی تھیں اور چوتھی گولی اس کی گردن کو پھاڑتی ہوئی گزر گئی۔اکٹھی چار گولیاں کھا کر وہ تیورا کر پشت کے بل کمرے کے پختہ فرش پر گرا اور پھر اس کا خون آلود پنجہ میکانکی انداز میں اٹھ کر اس کے چہرے کی طرف بڑھا۔دوسرے لمحے اس کے چہرے سے ایک جھلی اترتی چلی گئی۔شاید اس نے چہرے پر کوئی ڈریکولا نما ماسک چڑھا رکھا تھا۔ماسک کے اترتے ہی اس کا اصل روپ دیکھ کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا اور ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ کر کمرے کے پختہ فرش پر گر پڑا۔میں دوڑ کر اس کے قریب پہنچا اور بوکھلا کر کہا۔

"فر۔فرمان علی۔یہ یہ تم نے کیا۔کردیا۔اف خدایا؟"

میں سر تھام کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر اپنی پوری توانائی صرف کر کے بمشکل تمام بولا۔"سر! آج میں سرخرو ہوگیا ہوں میرے پاس۔وقت۔بہت۔کم ہے۔میں نے اپنی معصوم بہن۔صدف۔کا انتقام۔لے لیا۔ہے میں۔آپ سے......؟"

"فرمان علی! میں تمہیں ہسپتال لے چلتا ہوں شاید تم بچ جاؤ۔" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں سر اب۔میرا۔وقت۔پورا ہو چکا ہے۔میرے۔کمرے کی۔ٹیبل دراز۔میں الماری کی۔چابیاں موجود ہیں۔الماری۔میں۔وڈیرے کے خلاف تمام۔ثبوت۔موجود ہیں؟"

اتنا کہہ کر اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔پراسرار قاتل اپنی زندگی کا مقصد حاصل کر چکا تھا تبھی اس کے چہرے پر ابدی سکون کھیل رہا تھا۔

اس کے بعد کی کارروائی میں مجھے بہت کم وقت لگا تھا۔اے ایس آئی فرمان علی کے کمرے کی الماری سے مجھے وڈیرا سانول کے خلاف تمام ثبوت مل گئے تھے۔وڈیرا سانول نہ صرف ڈاکوؤں کی پشت پناہی کرتا تھا بلکہ سرحد پار سے آنے والے دہشت گردوں کو بھی مکمل سپورٹ فراہم کیا کرتا تھا۔وہ بلاشک وشبہ غیر ملکی ایجنٹ تھا اخباری رپورٹر صدف اے ایس آئی

فرمان علی کی چھوٹی بہن تھی۔ بڑی ایماندار، محنتی، اور ذہین رپورٹر تھی۔ وڈیرا سانول کے کالے دھندوں کے متعلق سن کر وہ گونھ مراد آئی تھی کہ اسکے کالے کرتوتوں کو بے نقاب کرسکے۔ پھر ایک دن وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئی اس نے جان ہتھیلی پر رکھ کر وڈیرا سانول اور غیر ملکی ایجنٹوں کی گفتگو ریکارڈ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تصویریں بھی اتار لی تھیں۔ اس کے علاوہ اس نے وڈیرے اور ڈاکوؤں کے تعلقات کے متعلق بھی ثبوت اکٹھے کرلیے تھے۔

مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ صدف کی یہ تمام کارروائی وڈیرا سانول کے علم میں آگئی اور پھر وڈیرے نے اپنے دو خاص آدمیوں (فضل داد اور محسن) کے ساتھ مل کر صدف کو نہایت بے رحمانہ طریقے سے زدوکوب کیا۔

وڈیرا سانول اور اس کے دونوں آدمیوں نے صدف سے ثبوت حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن طریقہ اپنایا اس کے ساتھ ایسا گھناؤنا اور اخلاق سوز سلوک کیا کہ شیطان بھی شرم کے مارے منہ چھپانے لگا مگر آفرین ہے اس حوا زادی پر جو مرتی مرگئی مگر وڈیرا سانول کو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیا۔

وڈیرا سانول کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ صدف نے مرنے سے پہلے اپنے بھائی فرمان علی کو بذریعہ خط اس جگہ سے آگاہ کردیا تھا جہاں وڈیرا سانول کے خلاف تمام ثبوت بحفاظت رکھے ہوئے تھے۔ صدف نے خط کے آخر میں اپنے بھائی سے التجائیہ انداز میں کہا تھا کہ اگر میں مرگئی تو میری موت کا ذمہ دار وڈیرا سانول، محسن اور فضل داد ہونگے۔ ان تینوں سے میری موت کا ایسا بھیانک انتقام لینا کہ دیکھنے والوں کی روح تک کانپ اٹھے۔

دوسرے دن میں بے شمار اخباری رپورٹرز کو وڈیرا سانول کے کالے کرتوتوں سے آگاہ کرنے کے ساتھ اس کے جرائم پر روشنی ڈال رہا تھا۔ تمام اخباری رپورٹرز کافی جوش وخروش کا مظاہرہ کررہے تھے کیونکہ ان کی ایک ساتھی اپنی زندگی کی قیمت پر وطن کے ایک دشمن کو بے نقاب کرنے کے ساتھ ساتھ جنت واصل کرگئی تھی۔

کر چلے ہم فدا جان و تن دوستو
اب تمہارے حوالے وطن دوستو



ادھورا خواب

وہ ایک بارونق مارکیٹ تھی۔ دکانیں ملکی اور غیر ملکی سامان سے بھری ہوئی تھیں۔

وہاں صبح سے لے کر رات گئے تک گاہکوں کا غیر معمولی رش رہتا تھا۔ مارکیٹ میں کار پارکنگ کے لیے ایک وسیع جگہ موجود تھی۔ اس مارکیٹ میں عام آدمی داخل ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ وہاں تو ملکی سرمایہ دار، سیاستدان، ان کی اولادیں یا پھر غیر ملکی سیاح ہی داخل ہونے کی جرأت کرسکتے تھے۔

البتہ فراز وہاں بے دھڑک جاسکتا تھا کیونکہ وہ ایک ایسے خاندان کا چشم و چراغ تھا جس کا ہر فرد منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوتا تھا۔ وہ اندرون سندھ کے ایک ایسے وڈیرے کا بیٹا تھا جس کی صرف زرعی اراضی ہزاروں ایکڑ زمین میں تھی، غیر آباد اراضی کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا۔

اس کے علاوہ فراز کا والد ایک مشہور و معروف سیاستدان بھی تھا اور خوش قسمتی سے ہمیشہ صوبائی اسمبلی کا رکن بھی رہتا تھا۔ کیونکہ وہ وفاداریاں بدلنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا اس لیے ہر منتخب ہونے والی حکومت کے ساتھ چپکا رہتا تھا۔

فراز نے اپنی نئی ماڈل کی چمچماتی ہوئی کار مارکیٹ کے پارکنگ ایریا میں روکی اور انجن آف کرکے اترنے ہی والا تھا کہ عین اسی وقت مارکیٹ میں ایک کھلی چھت کی جیپ داخل ہوئی اور دوسرے ہی لمحے فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ گولیوں کا نشانہ بننے والا کوئی بزنس مین معلوم ہوتا تھا جو سامنے والے ڈیپارٹمنٹ اسٹور سے نکل کر کار پارکنگ ایریے کی طرف آرہا تھا۔ اس کے جسم میں بے شمار گولیوں نے چھید کر ڈالے تھے۔ بیچارے کو تڑپنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ جیپ جتنی تیزی سے مارکیٹ میں داخل ہوئی تھی اتنی ہی تیزی سے باہر

نکل گئی تھی۔

یہ خونی منظر دیکھ کر فراز کے منہ سے ایک دہشت ناک چیخ نکلی اور پھر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ خوابگاہ میں زیرو بلب کی نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ خواب اتنا خوفناک تھا کہ موسم سرد ہونے کے باوجود اس کے جسم پر پسینے کے ٹھنڈے ٹھنڈے قطرے رینگ رہے تھے۔ اس نے بدقت تمام بستر سے اٹھ کر خوابگاہ کی لائٹ آن کر کے وال کلاک پر نظر ڈالی تو رات کے دو بجنے والے تھے۔

پانچ منٹ کے بعد ممی پاپا اس کی خواب گاہ میں موجود تھے۔ وہ اس کی چیخ کی آواز سن کر وہاں پہنچے تھے اور اسے حتی المقدور تسلی دینے کی کوشش کر رہے تھے لیکن فراز بے حد ہراساں نظر آ رہا تھا۔ پانی کا ایک گلاس وہ بغیر سانس لیے پی گیا تھا۔ ''پاپا! مجھے یقین ہے کہ میرا یہ خواب بھی سچ ہی نکلے گا۔ مجھے یہ خونی منظر بھی دیکھنا پڑے گا۔'' فراز نے انہیں خواب کی تفصیل بتاتے ہوئے آخر میں پریشان کن انداز میں کہا۔

''ڈونٹ بی سلی فراز۔'' وڈیرا سکندر خان نے خمار آلود لہجے میں جواب دیا۔ ''ہر خواب سچا تھوڑی نکلتا ہے وہ تو بس کبھی کبھار اتفاقاً ایسا ہو جاتا ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''پاپا! میں پریشان نہیں ہوں مگر پروفیسر لاشاری بھی غلط نہیں کہہ سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ میرے خواب قدرت کی طرف سے آگاہی پر مبنی ہوتے ہیں۔ پروفیسر لاشاری کے کہنے کے مطابق میں اپنے اس علم سے لوگوں کو فائدہ پہنچا سکتا ہوں۔ انہیں قبل از وقت آنے والے خطرے سے آگاہ کر کے ان کی مدد کر سکتا ہوں۔''

''ایک تو میں تمہارے اس پروفیسر لاشاری سے بڑا عاجز آ چکا ہوں۔ عجیب خبطی شخص ہے۔''

''آپ کچھ بھی کہہ لیں پاپا! لیکن میں پروفیسر لاشاری کی کسی بھی بات کو جھٹلانے کی کوشش نہیں کر سکتا۔''

''اچھا اب سو جاؤ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' اتنا کہہ کر وڈیرا سکندر خان بیگم کو ساتھ لے کر خواب گاہ سے باہر نکل گیا۔

فراز نے رات کا بقیہ حصہ سوچوں سے لڑتے ہوئے گزار دیا تھا۔ اسے صرف ایک

بات کا رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ کاش خواب میں مرنے والا شخص اسے کہیں ٹکرا جائے تو وہ آنے والی افتاد سے آگاہ کرے تاکہ وہ اپنا بچاؤ کر سکے۔

☆☆☆

دوسرے دن اس نے یونیورسٹی جانے کی بجائے خواب میں قتل کیے جانے والے بزنس مین کی تلاش شروع کر دی۔ لیکن اتنے بڑے شہر میں کسی اجنبی شخص کو ڈھونڈنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا مگر پھر بھی وہ اپنی سی کوشش کر رہا تھا اس سے قبل بھی اس نے اس قسم کے دو خواب دیکھے تھے جو حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئے تھے۔ ایک خواب میں اس نے اپنے ایک دوست کو سمندر میں ڈوبتے ہوئے دیکھا تھا اور دوسرے خواب میں یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کے گھر میں ڈاکا پڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ اپنے دوست کے ساتھ پروفیسر کو بھی اس نے قبل از وقت خواب کے متعلق آگاہ کر دیا تھا لیکن ان دونوں نے اس کی بات کو قابل اعتبار نہیں سمجھا تھا تاہم اس وقت خود اس نے اپنے ان خوابوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی لیکن جب یکے بعد دیگرے اس کے دیکھے ہوئے دونوں خواب سچ ثابت ہوئے تھے تو وہ بے حد پریشان ہو گیا تھا۔

پروفیسر لاشاری جو یونیورسٹی میں نفسیات پڑھاتا تھا اس نے فراز کے ان خوابوں کو قدرت کی طرف سے قبل از وقت آگاہی بتایا تھا اب یہی آگاہی اس کے لیے عذاب کا روپ دھار چکی تھی۔

سارے دن کی تلاش کے باوجود فراز اس شخص کو نہیں ڈھونڈ پایا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بھوسے میں سے سوئی تلاش کر رہا ہے مگر ایک موہوم سی امید کے سہارے وہ اجنبی شخص کی تلاش کا کام جاری رکھے ہوئے تھا وہ ہر صورت میں اس اجنبی شخص کو موت کے خون آشام جبڑے سے بچانا چاہتا تھا۔ جانتے بوجھتے وہ فطرت سے جنگ لڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

شام کے وقت جب وہ تھکا ہارا گھر پہنچا تو پاپا کے سامنے اس کی طلبی ہو گئی۔ ''یہ تم آج سارا دن شہر کی سڑکیں کیوں ناپتے رہے ہو؟'' وڈیرا سکندر نے قدرے غصے سے سوال کیا۔

''پاپا! میں خواب میں قتل ہونے والے اس اجنبی شخص کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

''ایسی کوشش تم دو مرتبہ پہلے بھی کر چکے ہو مگر نہ تو اپنے دوست کو ڈوبنے سے بچا سکے ہو اور نہ ہی پروفیسر کے گھر کو لٹنے سے، پھر کیا فائدہ ایسی احمقانہ کوشش کا۔ خواہ مخواہ کیوں

اپنا وقت ضائع کر رہے ہو؟"

"کوشش کرنے میں کیا حرج ہے پاپا۔" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔ "اگر میری وجہ سے ایک انسان کی زندگی بچ جائے تو کیا یہ بری بات ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ میں اسے بہت جلد ڈھونڈ لوں گا۔"

"دیکھو فراز۔" وڈیرا سکندر خان ناصحانہ انداز میں بولا۔ "میں تمہارا باپ ہوں، ظاہر ہے میں تمہارا بھلا ہی سوچوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ شخص اگر تمہیں مل گیا تو تمہاری بات پر کان نہیں دھرے گا۔ اس کمپیوٹرائزڈ دور میں ایسی بے سروپا باتوں کو کون مانتا ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم اس شخص کی تلاش ترک کر کے اپنی تعلیم پر توجہ دو۔ زندگی اور موت کا دارومدار تمہارے خوابوں پر نہیں ہے بلکہ اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے پاپا کہ زندگی اور موت کے فیصلے آسمانوں پر ہوتے ہیں لیکن زمین پر رہنے والوں کا بھی تو کچھ نہ کچھ واسطہ ہوتا ہے ایسے معاملات سے، اس لیے میں اس شخص کی تلاش کر رہا ہوں ہوسکتا ہے کہ وہ میری بات مان لے اور اس ناگہانی سے بچ جائے۔"

"او کے یہ کوشش بھی کر دیکھو۔" وڈیرا سکندر خان نے جیب سے موبائل فون نکالتے ہوئے جواب دیا۔

"تھینک یو پاپا۔" باپ کی اجازت ملتے ہی اس کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

تیسرے دن اچانک ایک ریسٹورنٹ میں وہی شخص اسے ٹکرا گیا۔ اپنا تعارف کروانے کے بعد فراز بلا جھجک اس سے بولا۔ "سر! کیا آپ میری ایک بات سنیں گے۔؟"

"بالکل سنوں گا۔ بولیے کیا کہنا چاہتے ہو؟" شخصیت کی طرح اس کا انداز گفتگو بھی متاثر کن تھا۔

"آپ..... آپ خوابوں پر یقین رکھتے ہیں؟" اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"بس اتنا یقین رکھتا ہوں کہ خواب، خواب ہوتے ہیں، انسانوں کو ایسے مناظر دکھاتے ہیں کہ جو وہ رئیل لائف میں کبھی نہیں دیکھ سکتا۔"

"مطلب آپ خوابوں کو قابل توجہ نہیں سمجھتے؟" اس نے قدرے پریشان کن انداز میں پوچھا۔

"ارے بھئی ہم گنہگاروں کے خواب سچے تھوڑی ہوسکتے ہیں اور پھر آج کل تو ویسے

بھی زیادہ تر لوگ معدے کی خرابی کی وجہ سے الٹے سیدھے خواب دیکھتے رہتے ہیں جن کا حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا۔"

"مگر سر میرا ہر خواب سچا ہوتا ہے۔ اب تک میں نے دو ایسے خواب دیکھے ہیں جو حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئے ہیں۔" فراز نے آخری الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"مثلاً؟" اس نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا اور فراز نے من وعن اسے دونوں خوابوں کے متعلق بتا دیا۔

فراز سے خوابوں کی تفصیل سن کر وہ تبسم آمیز لہجے میں بولا۔ "برخوردار! تم اچھا مذاق کر لیتے ہو مگر میں بہت مصروف شخص ہوں کبھی وقت ملا تو تم سے خوب گپ شپ لگاؤں گا اس وقت تو مجھے اجازت دیجئے۔"

"مگر سر! آپ نے میری بات تو سنی ہی نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔

"چلو پھر ایک اسٹرانگ سی کافی بھی پیتے ہیں اور تمہاری بات بھی اطمینان سے سن لیں گے۔" وہ ایک خالی ٹیبل کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

ویٹر کو دو کافی کا آرڈر دینے کے بعد وہ فراز کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "ہاں اب بتاؤ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"سر! میں چاہتا ہوں کہ آپ شہر کی کسی بھی مارکیٹ کا رخ نہ کریں ورنہ آپ کی جان جا سکتی ہے۔"

"تم اتنے وثوق کے ساتھ یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو؟" اس نے مشکوکانہ انداز میں فراز کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"میں نے خواب میں دیکھا۔ کچھ لوگ ایک مارکیٹ میں آپ پر گولیاں چلا رہے ہوتے ہیں اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے آپ کی جان نکل جاتی ہے۔ قاتل ایک کھلی چھت کی جیپ میں سوار ہوتے ہیں اور وہ آپ کو قتل کرنے کے بعد فوراً مارکیٹ سے نکل جاتے ہیں۔ میں گزشتہ تین روز سے یہی بات بتانے کے لیے آپ کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔"

فراز کا جواب سن کر ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں پریشانی کے سائے لہرائے مگر پھر وہ سنبھل کر بولا۔ "برخوردار! شہرت حاصل کرنے کا یہ طریقہ بہت سستا اور عامیانہ ہے۔ تم کوئی اور کام نہیں کرتے۔ مثلاً پاپ سنگنگ۔"

"سر پلیز۔" وہ التجائیہ انداز میں بولا۔ "میرا یقین کیجئے میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں آپ کو ایک اذیت ناک موت سے بچانا چاہتا ہوں۔"

"او کے برخوردار! میں احتیاط کروں گا۔"

"تھینک یو سر۔" وہ پر مسرت لہجے میں بولا۔

تھوڑی دیر کے بعد ویٹر نے انہیں کافی سرو کردی تھی۔ جاتے جاتے وہ شخص اپنا وزیٹنگ کارڈ فراز کو تھما گیا تھا۔ کارڈ پر اس کا نام جمشید کمال درج تھا۔

☆☆☆

جمشید کمال نے وقتی طور پر فراز کو ٹالنے کے لیے اس سے وعدہ تو کرلیا تھا لیکن اس وعدے کو ایفا کرنے کے لیے وہ بالکل غیر سنجیدہ تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ فراز کی بات کو اس نے ایک عمدہ قسم کے مذاق پر محمول کیا تھا۔

اس ملاقات کے ٹھیک پانچویں روز اسی مارکیٹ میں فراز کی آنکھوں کے سامنے جمشید کمال کھلی چھت کی جیپ والے قاتلوں کی گولیوں کا نشانہ بن چکا تھا۔ یہ تمام واقعہ بالکل اسی طرح پیش آیا تھا جس طرح فراز نے خواب میں دیکھا تھا۔

اس واقعے نے فراز کے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی راتوں کی نیند اور دن کا قرار کھو گیا۔ ہفتہ بھر کے لیے تو وہ بالکل اپنے کمرے میں محصور ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ کھانا تک رغبت سے نہیں کھاتا تھا۔ مارے خوف کے اس کی آنکھ تک نہیں لگتی تھی۔ وہ حتی الوسع جاگنے کی کوشش کرتا رہتا تھا کیونکہ نیند میں پھر کوئی خونی خواب اسے دکھائی دے سکتا تھا۔ ان آگہی پر مبنی خوابوں نے اس کا جینا دوبھر کردیا تھا۔ جاگتے ہوئے بھی اسے اپنے چاروں طرف سے موت رقص کرتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

وہ ہر وقت ڈرا ڈرا سا رہنے لگا اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ ہمیشہ کے لیے سونا ترک کردیتا لیکن بقائے انسانی کے لیے کھانے پینے کی طرح نیند بھی لازمی ہے۔ سو وہ بھی جیسے تیسے کر کے سو ہی جاتا تھا۔

ایک ماہ بعد جب وہ کسی حد تک ان عذاب ناک خوابوں کو بھول چکا تھا اور بڑی حد تک پرسکون زندگی بسر کر رہا تھا کہ اچانک ایک رات پھر اس نے ایک خوفناک خواب دیکھا۔ یہ خواب بھی خوف ناک و دہشت انگیز تھا۔

خواب۔۔ وہ ایک نوجوان شخص کو دیکھتا ہے جو تقریباً دوڑنے کے انداز میں روڈ کراس کرنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے مگر اچانک ایک آئل ٹینکر کی زد میں آجاتا ہے۔

یکایک خوف کے مارے اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ خواب میں اسے نوجوان کی صرف پشت نظر آتی ہے مگر عجیب بات یہ تھی کہ پشت کی جانب سے وہ نوجوان اسے شناسا سا لگتا تھا اس نے حادثے کا شکار ہونے والے نوجوانوں کو کہیں دیکھا تھا مگر کہاں؟ یہ اسے ذہن پر زور دینے کے باوجود یاد نہیں آرہا تھا۔

"اے کاش میں اس کا چہرہ دیکھ پاتا" اس نے دل ہی دل میں سوچا لیکن خواب تو خواب ہوتے ہیں۔ انسان کے دائرہ اختیار سے بالکل باہر ہوتے ہیں۔ انسان اگر خوابوں پر قادر ہوتا تو پھر وہ ایسے خواب دیکھتا ہی کیوں؟

بات اگر یہیں تک محدود رہتی تو پھر بھی ٹھیک تھا لیکن وہ خواب ہر رات اسے تواتر کے ساتھ نظر آنے لگا مگر اسی طرح ادھورا۔ ایک بار بھی اسے نوجوان کا چہرہ نظر نہیں آیا تھا البتہ پشت کی جانب سے وہ اسے ہر مرتبہ شناسا سا لگتا تھا۔ لاکھ کوششوں کے باوجود بھی وہ اسے نہیں پہچان پاتا تھا۔ وہ رات رات بھر جاگتا رہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جلد یا بدیر اسے یہ خونی منظر بھی دیکھنا پڑے گا۔

وہ خود کو بہت بے بس محسوس کر رہا تھا۔ آخر کار تھک ہار کر اس نے ایک ماہر نفسیات کی طرف رجوع کرلیا تاکہ اسے اس ادھورے خواب کے عذاب سے چھٹکارا مل سکے۔

ڈاکٹر خان شہر کا مانا ہوا ماہر نفسیات تھا اور اس بات کا پورا شہر معترف تھا کیونکہ وہ بہت سے پیچیدہ قسم کے کیس حل کرچکا تھا۔ اس کے پاس اکثر ایسے مریض بھی لائے گئے تھے جن کے لواحقین بالکل مایوس اور ناامید ہو چکے تھے لیکن ڈاکٹر خان کے مخصوص طریقہ علاج سے ان میں سے کئی مریض نارمل زندگی گزارنے کے قابل ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر خان نے فراز کی پوری بات توجہ اور تحمل سے سنی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے مریضوں پر خصوصی توجہ دیا کرتا تھا۔ باتوں باتوں میں مریض کو دوست بنالیا کرتا تھا تاکہ مریض کھل کر اپنے مرض کے متعلق اسے معلومات بہم پہنچا سکے اس طرح اسے مریض کا علاج کرنے میں آسانی رہتی تھی۔

"مسٹر فراز! یہ خواب کتنے عرصے سے دیکھ رہے ہوں؟" ڈاکٹر خان نے مشفقانہ

انداز میں سوال کیا۔

''گزشتہ پانچ چھ ماہ سے۔'' اس نے بلا تامل جواب دیا۔

''میں اس ادھورے خواب کے متعلق پوچھ رہا ہوں؟ ڈاکٹر خان نے اس بار مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

''یہ خواب تو میں پچھلے ایک ہفتے سے متواتر دیکھ رہا ہوں لیکن پرابلم وہی ہے جو میں آپ کو بتا چکا ہوں، خواب میں مجھے اس نوجوان کا چہرہ نظر نہیں آتا ہے حالانکہ پشت کی جانب سے وہ مجھے شناسا سا لگتا ہے۔''

''وہ تمہارے دوستوں میں سے بھی کوئی ہوسکتا ہے۔ تم دماغ پر زور ڈال کر یاد کرنے کی کوشش کرو۔ کوئی ایسا جو تم سے بہت کم ملتا ہو یا پھر تم سے قطع تعلق کر چکا ہو۔ ایسا اکثر ہوتا رہتا ہے کہ آدمی کسی شناسا کو یکسر فراموش کر چکا ہوتا ہے لیکن اس کی یاد آدمی کے لاشعور میں کہیں نہ کہیں موجود ہوتی ہے۔'' ڈاکٹر خان پیشہ ورانہ انداز میں بولا۔

فراز نے ایک لمحے کے لیے ذہن پر زور ڈال کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ اس کے دوستوں میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو ہر دوسرے روز اس سے نہ ملتا

''نہیں ڈاکٹر صاحب!'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میرے دوستوں میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہے، جس سے میں نے قطع تعلق کر لیا ہو۔ خواب میں نظر آنے والے نوجوان میرا دوست نہیں ہے یہ بات میں پورے یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ وہ صرف میرا شناسا ہے یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے میں نے صرف ایک آدھ بار کہیں دیکھا ہو۔''

''اچھا فی الحال اس شناسا کو رہنے دیجیے۔'' ڈاکٹر خان موضوع بدلتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تم یہ بات اتنے یقین کے ساتھ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ تمہارے دیکھے ہوئے سب خواب حرف بہ حرف سچ ثابت ہوتے ہیں۔''

''میں نے ان خوابوں کو سچ ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' وہ پر جوش انداز میں بولا۔

ڈاکٹر خان ایک لمحہ توقف کے بعد بولا۔ ''یہ محض اتفاق بھی ہوسکتا ہے۔ اس شہر میں روزانہ ایسے واقعات روزانہ کے معمولات ہیں۔ روڈ ایکسیڈینٹ اور پبلک پلیس پر فائرنگ

روزانہ کے معمولات ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم اپنے خوابوں کا سلسلہ خواہ مخواہ اندوہناک واقعات کے ساتھ جوڑ رہے ہو۔ حرف بہ حرف سچ ثابت ہونے والی بات تمہارا وہم بھی ہوسکتی ہے۔ زیادہ سوچو گے تو تمہارے سامنے والا ہر واقعہ تمہیں اپنے کسی خواب کے ساتھ منسلک نظر آئے گا۔''

''نہیں ڈاکٹر صاحب! آپ کی تشخیص غلط رخ پر جا رہی ہے۔ شاید آپ گھما پھرا کر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں خدانخواستہ خبط یعنی (Obsession) کا شکار ہوں۔ اگر واقعی ایسی بات ہے تو پھر مجھے نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑے گا کہ میں نے علاج کے لیے آپ کا انتخاب کر کے غلطی کی ہے۔''

''میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی ہے مسٹر فراز۔'' ڈاکٹر خان نے اس کی بات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا'' میں اپنے طریقے سے تمہارا علاج کروں گا اور انشاء اللہ میرا علاج سو فیصد کامیاب ہوگا۔ کچھ عرصے کے بعد تمہیں کسی قسم کے خواب نظر نہیں آئیں گے۔ فی الحال میں یہ کچھ میڈیسن لکھ رہا ہوں یہ باقاعدگی کے ساتھ استعمال کرتے رہنا۔''

اتنا کہہ کر ڈاکٹر خان نے اپنے سامنے پڑے ہوئے پیڈ پر میڈیسن لکھیں اور پھر پیڈ سے وہ کاغذ کھینچ کر فراز کے حوالے کر دیا۔'' ایک ہفتے کے بعد دوبارہ تشریف لانا۔'' ڈاکٹر خان نے اس سے ہاتھ ملا کر کہا اور وہ خدا حافظ کہتے ہوئے رخصت ہوگیا۔

ڈاکٹر خان کے علاج سے صرف اتنا ہوا تھا کہ اب وہ خواب فراز کو تواتر کے ساتھ نظر نہیں آتا تھا تاہم ہفتے میں ایک دو بار اسے وہ خواب لازمی دکھائی دیتا تھا۔ پہلے روز سے لے کر آج تک خواب کی سچویشن میں ذرا بھر بھی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔

وہ یونیورسٹی میں اکثر نوجوان لڑکوں کو پشت کی طرف سے بہت غور کے ساتھ دیکھتا رہتا تھا لیکن ہنوز ناکام چلا آ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ پھر اس پر جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی۔ ممی پاپا ہر ممکن طریقے سے اس کی دلجوئی کرتے رہتے تھے لیکن وہ ان کی کسی بات کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

وہ خوفناک خواب کس طرح بھی اس کی جان نہیں چھوڑ رہا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی اسی حالت کے پیش نظر ایک دن ڈیڈی سکندر خان خود ڈاکٹر خان کے کلینک جا پہنچا۔ ڈاکٹر خان نے سے اپنا تعارف اس نے فراز کے

پاپا کی حیثیت سے کروایا تھا۔

"ڈاکٹر خان۔" تعارف کے بعد وہ بلا تمہید بولا۔ "میں فراز کی طرف سے بہت فکر مند ہوں۔ کیا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے کہ فراز کو خواب دکھائی ہی نہ دیں۔"

"یہ بات میں فراز کو پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ کسی حد تک ایسا ممکن ہے لیکن اس میں وقت بہت لگتا ہے۔ سب سے پہلے تو فراز کے لیے پرسکون نیند بہت ضروری ہے دوسرا کچھ مدت کے لیے فراز کو فضول گھومنے سے بھی اجتناب کرنا پڑے گا کیونکہ اس شہر کا امن رخصت ہوئے عرصہ ہو چکا ہے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی اندوہناک واقعہ پیش آ جاتا ہے۔ فراز جب اپنی آنکھوں سے ایسے واقعات دیکھتا ہے تو اس کے ذہن پر منفی اثر پڑتا ہے۔ آپ فراز کے معمولات پر نظر رکھیں اور حتی الوسع اسے اکیلا نہ گھومنے دیں۔ اس کے ساتھ میرا علاج بھی جاری رکھیں۔ مجھے یقین ہے کہ فراز بہت جلد ان خوابوں سے چھٹکارا حاصل کر لے گا۔"

ڈاکٹر خان نے تفصیلی جواب دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن فراز آج کل ایک ادھورے خواب کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔"

ڈاکٹر خان نے کہا۔ "اس خواب کے متعلق مجھے معلوم ہے کہ اس کی توجیہ میں یہی پیش کر سکتا ہوں کہ فراز نے اپنے بچپن میں ایسا کوئی واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جو اس کے لاشعور میں کہیں دبا ہوا تھا اور اب خواب کے ذریعے منکشف ہو رہا ہے۔"

"ڈاکٹر خان! فراز میرا اکلوتا بیٹا ہے اس کے علاج میں میں کروڑوں روپیہ بھی خرچ کر سکتا ہوں لیکن اسے ایک نارمل انسان کی طرح زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس کا علاج انگلینڈ یا امریکہ جیسے کسی ترقی یافتہ ملک میں با آسانی ہو سکتا ہے تو میں یہ بھی کرنے کے لیے تیار ہوں۔" وزیر اسکندر خان نے پرامید لہجے میں پوچھا۔

"خدانخواستہ یہ کوئی اتنا خطرناک مرض تو نہیں ہے۔" ڈاکٹر خان تسلی آمیز انداز میں بولا۔ "اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں خود آپ کو کسی ملک میں جانے کا مشورہ دیتا۔ آپ بس میری ہدایات پر عمل کریں انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"او کے تھینک یو ڈاکٹر۔" وہ اجازت طلب انداز میں بولا اور ڈاکٹر خان اسے کلینک کے باہر تک چھوڑ گیا۔

☆☆☆

اس دن فراز نے یونیورسٹی سے جلدی چھٹی کر لی تھی۔ دراصل آج اسے ڈاکٹر خان کے کلینک پر جانا تھا۔ گھر پہنچتے ہی وہ باتھ روم میں گھس گیا۔ ایک بھرپور شاور لینے کے بعد وہ تولیہ لپیٹ کر باتھ روم سے باہر آ گیا۔ کپڑوں کی الماری کھول کر اس نے ایک نیو بلو کلر کا سوٹ نکالا اور اسے بیڈ پر اچھال دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک قدم آدم آئینے کے سامنے کھڑا ٹائی کی ناٹ درست کر رہا تھا۔ یونہی اچانک اس نے آئینے میں اپنے لباس پر ایک نظر ڈالی اور اس کے پورے بدن میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ دہشت کے مارے وہ ایک جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ اس نے جو سوٹ پہن رکھا تھا وہ بالکل اسی کلر کا تھا جو وہ گزشتہ کچھ عرصے سے خواب میں نظر آنے والے نوجوانوں کے جسم پر دیکھتا آ رہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے تو اس نے سوچا کہ کوئی اور سوٹ پہن لے مگر پھر ڈاکٹر خان کی باتیں یاد کر کے اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ "شاید ڈاکٹر خان ٹھیک کہتا ہے کہ میں وہمی ہوتا جا رہا ہوں۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر جلدی سے لنچ کرنے کے لیے ڈائننگ ہال کی طرف چل دیا۔ پاپا موجود نہیں تھے۔ اس نے ممی کے ساتھ مل کر لنچ کیا اور پھر ممی سے اجازت طلب کر کے ڈاکٹر خان کے کلینک کی طرف روانہ ہو گیا۔

سفاری پارک سے گزرتے ہوئے وہ بیا چورنگی پہنچ گیا۔ گاڑی وہ احتیاط کے ساتھ ڈرائیو کر رہا تھا۔ مسلسل خونچکاں خواب دیکھنے کے بعد وہ بہت محتاط ہو گیا تھا۔ اب وہ یونیورسٹی روڈ پر تھا۔ وہاں سے وہ حسن اسکوائر کی طرف گھوم گیا۔ لیاری ندی کا پل کراس کرنے کے بعد وہ مختلف سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے شاہراہ ابن سینا پر پہنچ گیا۔ چورنگی پٹرول پمپ کے عین سامنے اچانک اس کی گاڑی دو تین جھٹکے کھا کر ایک دم رک گئی۔

نیچے اتر کر اس نے گاڑی کو اچھی طرح چیک کیا۔

پیٹرول کی ٹینکی آدھے سے زیادہ بھری ہوئی تھی۔ وہ بونٹ کھول کر انجن پر جھک گیا۔ چند تاروں کو چھیڑنے کے بعد اس نے بونٹ دوبارہ بند کیا اور اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگا مگر گاڑی میں ایک ہلکی سی جنبش بھی پیدا نہ ہوئی۔ ڈاکٹر خان کا کلینک ابھی کافی دور تھا۔ وہاں تک وہ پیدل بھی نہیں جا سکتا تھا۔ گاڑی اس نے سائیڈ پر روک رکھی تھی روڈ کے دوسری جانب ایک ورکشاپ موجود تھی۔ اس نے کھٹاک سے گاڑی کا

دروازہ کھولا اور نیچے اترنے کے بعد لات مار کر دوبارہ دروازہ بند کر دیا۔ ایک دم ہی اس پر جھنجھلاہٹ سوار ہو گئی تھی۔ ''اس کو بھی ابھی خراب ہونا تھا'' وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

پھر نہ جانے اس کے جی میں کیا سمائی کہ اس نے دوڑنے کے انداز میں روڈ کراس کرنے کی کوشش کر ڈالی۔ دن کا وقت ہونے کی وجہ سے روڈ پر ٹریفک کا کافی رش تھا۔ ابھی وہ روڈ کے عین درمیان میں ہی تھا کہ دفعتاً ایک آئل ٹینکر اسے کچلتے ہوئے گزر گیا۔

آخری سانسوں کے دوران اس کے ذہن میں ایک منظر ابھر کر معدوم ہو گیا۔ یہ منظر ''نیو اسٹائلش ہیئر کٹنگ سیلون'' کا تھا جہاں پر وہ ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ بال کٹوانے کے لیے جایا کرتا تھا۔ ہیئر کٹنگ سیلون پر چاروں طرف جمبو سائز آئینے لگے ہوئے تھے جن میں گاہکوں کو اپنی پشت کے ساتھ ساتھ دایاں بایاں سائیڈ بھی صاف اور واضح نظر آتا تھا۔ اس کو بھی وہاں ایک دو مرتبہ اپنی پشت صاف نظر آئی تھی۔ اس کی پشت کا یہ منظر اس کے لاشعور میں کہیں محفوظ ہو کر رہ گیا تھا اور اب یاد بھی آیا تھا تو زندگی کی آخری سانس لیتے ہوئے۔ مرتے مرتے بھی وہ اس شناسا اجنبی کو پہچان گیا تھا۔ اب نہ خواب رہے تھے اور نہ ہی خوابوں کا عذاب۔



وہ کون تھا؟

اپنے حلیے سے وہ ایک پیشہ ور بھکاری نظر آ رہا تھا تیل اور ڈیزل کے بڑے بڑے دھبے جو اس کے سیاہ لباس پر چار چاند لگا رہے تھے اسے کسی ورکشاپ کا ایک ادنیٰ ملازم ظاہر کر رہے تھے۔ اس نے آنکھوں پر موٹے شیشوں والا بینائی کا چشمہ لگا رکھا تھا جس کے عقب میں اس کی آنکھیں کسی بیل کی آنکھوں سے بڑی تو نہیں البتہ بیل کی آنکھوں کے لگ بھگ نظر آ رہی تھیں۔

کندھے پر ایک میلی کچیلی اور پیوند لگی چادر اور سر پر ایک سالخوردہ کشمیری رومال چلا چلا کر لوگوں کو اس کی مفلسی کا حال بتا رہے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں ایک سیاہ رنگ کا پرانا سا کپڑے کا تھیلا لٹک رہا تھا۔

آس پاس سے گزرنے والے لوگوں کو وہ یوں گھور گھور کر دیکھ رہا تھا جیسے وہ اچانک ہی پتھر کے دور سے اس جدید دور میں آ گیا ہو۔ بازار کے بیچوں بیچ گزرتا ہوا وہ ایک قریبی فٹ پاتھ پر پہنچا جہاں ایک طرف ایک نوجوان نے دال روٹی کی ریڑھی لگا رکھی تھی اور اس کے ساتھ والی ریڑھی پر ایک عمر رسیدہ شخص کوئی سستا سا شربت بیچ رہا تھا۔

نوجوان ریڑھی بان نے اس ادھیڑ عمر شخص کو دیکھ کر فوراً پوچھا۔ ''کیا چاہیے جناب! دال روٹی یا چاول چھولے؟''

''جو سستا پڑے وہی دیدے میاں!! ہم کونسے نواب ہیں۔''

اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''سستی تو پھر دال روٹی پڑے گی جناب! چاول چھولے تو آج کل ویسے ہی مہنگے ہو گئے ہیں۔'' نوجوان نے چہرے پر کاروباری مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

"چلے گی چلے گی دال روٹی بھی چلے گی لیکن میں ہر چیز پہلے چکھتا ہوں بعد میں خریدتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنا بوسیدہ تھیلا بڑی لاپرواہی کے ساتھ کرسی کے قریب فٹ پاتھ پر رکھ دیا۔

نوجوان ریڑھی بان نے اس کی بات سن کر تعجب خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پھر ایک پلاسٹک کی پلیٹ میں تھوڑی سی دال ڈال کر اس کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ "لیجئے جناب! چکھ لیں ایک دم فسٹ کلاس دال ہے اگر کھا کر لطف نہ آ جائے تو میرا نام بدل دینا۔"

"میاں! نام بدلنے سے کیا ہوگا کام بدل لینا اور ہاں ایک آدھ روٹی بھی پکڑا دے بغیر روٹی کے بھلا دال کیسے چکھی جا سکتی ہے۔"

نوجوان نے پلاسٹک کے بنے ہوئے چھابے سے ایک روٹی نکالی اور با دل نخواستہ اس کے میلے ہاتھ پر رکھ دی۔

اس نے جلدی جلدی ایک روٹی کو اس تھوڑی سی دال کے ساتھ حلق سے نیچے اتار اور دوبارہ نوجوان ریڑھی بان کی طرف متوجہ ہو گیا جو ابھی تک تحیر آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"بولیئے جناب! دال روٹی کیسی تھی؟" نوجوان نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"برخوردار! کچھ خاص مزہ تو نہیں آیا لیکن میں پھر بھی یہ کہہ کر آپ کا دل توڑنا گوارا نہیں کروں گا کہ دال روٹی کام کی نہیں تھی۔"

اس کا جواب سن کر نوجوان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ تاہم اس نے اپنی اندرونی کیفیت کا اظہار چہرے سے نہ ہونے دیا مگر اس ادھیڑ عمر شخص کی جہاندیدہ نظروں سے نوجوان کا غصہ پوشیدہ نہ رہ سکا تبھی وہ جلدی سے بولا "برخوردار! میں آپ سے دال روٹی تو نہیں خریدوں گا البتہ میرا ایک اصول ہے کہ جو چیز میں چکھ بھی لوں اس کے بھی دام ادا کرتا ہوں۔ ذرا پانی کا ایک گلاس دینا۔"

نوجوان نے خوش ہو کر اسے پانی کا ایک گلاس تھمایا اور ایک دوسرے گاہک کی طرف متوجہ ہو گیا جو ریڑھی کے نزدیک آ چکا تھا۔

اس نے غٹا غٹ پانی کا گلاس پیا اور ایک مصنوعی ڈکار لے کر اٹھ کھڑا ہوا، پھر اس نے اپنی قمیض کی سائیڈ جیب میں ہاتھ ڈالا اور تقریباً بیس برس پرانا ایک روپے کا ایک سکہ نکال کر نوجوان ریڑھی بان کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

نوجوان ایک روپے کا سکہ دیکھ کر اس طرح بوکھلایا جیسے کسے نے اس کی ہتھیلی پر زندہ بچھو رکھ دیا ہو۔

"جج۔ جناب.. یہ کیا ہے؟"

"ارے احمق! ایک روپے کا سکہ ہے۔ کیا نظر نہیں آتا۔ غور سے دیکھو۔" ادھیڑ عمر شخص نے یوں جواب دیا جیسے کوئی اہم انکشاف کر رہا ہو۔

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے مگر جناب......؟"

نوجوان دوبارہ گڑگڑایا مگر وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"یہ کام ہے یہی کہنا چاہتے ہو نا؟ ارے بھائی کبھی کسی نے کوئی چیز چکھنے کے بھی دام ادا کیے ہیں یہ تو ہم ہیں، ہر کوئی ہماری طرح بااصول تو نہیں ہوتا نا۔"

"بھاڑ میں گئے تم اور تمہارے اصول۔"

نوجوان نے بغیر دیکھے سکہ گلے میں پھینک دیا اور خود ایک بالٹی موجود پلیٹیں صاف کرنے میں مصروف ہو گیا ادھیڑ عمر شخص کو اس نے یوں نظرانداز کر دیا تھا جیسے کوڑے کے ڈرم میں پڑے کچرے کی طرف کوئی راہ گیر نہیں دیکھتا۔

اس نے بھی موقع غنیمت جانا اور جلدی سے اپنا تھیلا اٹھا کر ایک طرف کو کھسک گیا اور اسے اپنے عقب میں نوجوان ریڑھی بان کی بڑبڑاہٹ صاف سنائی دے رہی تھی لیکن اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

پیدل چلتے چلتے آخرکار وہ شہر کے ایک مشہور بس اسٹاپ پر پہنچ گیا۔ یہ بس اسٹاپ اتنا بڑا تھا کہ یہاں سے تقریباً ملک کے ہر بڑے شہر کے لیے بہترین گاڑی باآسانی دستیاب ہو جاتی تھی۔

بس اسٹاپ پر ہر شعبہ زندگی سے متعلق ہر قسم کے لوگ گھوم رہے تھے۔ امیر غریب، شرفاء، بدمعاش، جیب کترے، بھکاری غرض وہاں طرح طرح کے لوگ موجود تھے۔

وہ عجیب و غریب ادھیڑ عمر شخص بڑے اطمینان سے چلتا ہوا ایک جدید اسٹائل کی

خوبصورت سی کوسٹر کے نزدیک پہنچا وہاں ایک طرف میز کرسی ڈالے ایک تیز وطرار شخص بیٹھا سواریوں کو ٹکٹ کاٹ کاٹ کر دے رہا تھا یہ بکنگ کلرک تھا۔

وہ ٹیبل کے نزدیک پہنچا اور ابھی کچھ بولنے والا ہی تھا کہ بکنگ کلرک نے اچانک اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا اور درشت لہجے میں بولا۔ ''معاف کرو بابا! ابھی صرف چند سواریاں ہی ملی ہیں۔''

''ارے میاں! غصہ کاہے کو کرتے ہو ہم بھکاری تو نہیں ہیں ٹکٹ خریدنا ہے ہمیں۔''

بکنگ کلرک نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے بڑی شرمندہ پیشانی سے بولا۔ ''معاف کرنا بابا! میں آپ کے حلیے سے دھوکا کھا گیا، بولیے کہاں کا ٹکٹ چاہیے۔ سیدھے ملتان جانا ہے یا راستے میں کہیں اتر جانا ہے۔''

بکنگ کلرک کی زبان سے معذرت کے الفاظ سن کر وہ یکدم خوشی سے پھول گیا اور اس کی باچھیں ضرورت سے کچھ زیادہ کھل گئیں۔ تاہم وہ اس وقتی خوشی پر قابو پا کر پریشان کن انداز میں بولا۔ ''میاں، جانا تو ملتان ہی تھا لیکن وہ کیا ہے کہ ہمارے پاس کرایہ کے لیے رقم تھوڑی کم پڑ گئی ہے اگر ہو سکے تو......؟''

وہ بات ادھوری چھوڑ کر سوالیہ انداز میں بکنگ کلرک کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

بکنگ کلرک نے پہلے تو مشکوک انداز میں اس کی طرف دیکھا پھر خالص کاروباری انداز میں بولا۔ ''بابا جی! کرایے کی رقم کتنی کم پڑتی ہے؟''

''یہی کوئی دس پندرہ روپے کم ہوں گے لیکن وہ بھی ہم ادھار کریں گے ملتان پہنچتے ہی بقایا رقم آپ کی ہتھیلی میں رکھ دوں گا۔ ہم خاندانی لوگ ہیں ہر کسی سے معاملہ صاف رکھتے ہیں۔''

اس نے چرب زبانی سے کام لیتے ہوئے بکنگ کلرک کو جواب دیا۔

''دس پندرہ روپے تو اتنی کوئی خاص بڑی رقم نہیں ہے لیکن جگہ آخری سیٹ پر ملے گی۔'' بکنگ کلرک نے جان چھڑانا چاہی۔

''ارے میاں! ہم کوئی فرنٹ سیٹ تھوڑی مانگتے ہیں آپ سے۔ ہم تو چھت پر بیٹھ کر بھی چلے جائیں گے آخری سیٹ کوئی ملتان نہیں جائے گی۔'' اس نے بکنگ کلرک کی ساری

چالاکی پر ایک لمحے میں پانی پھیر دیا۔

''کوئی اونچی شے معلوم ہوتے ہیں بابا جی۔'' بکنگ کلرک خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا لیکن اس کے تیز کانوں تک یہ بڑبڑاہٹ پہنچ گئی تھی۔ وہ ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔

''ارے میاں! ہم کون ہوتے ہیں اونچی شے بننے والے سب سے اونچا تو وہ دور آسمان پر بیٹھا ہے۔'' اس نے شہادت کی انگلی اٹھا کر آسمان کی طرف اشارہ کیا اور بکنگ کلرک شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا۔

''ارے میاں! اب شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں اگر سیٹ نہیں ملتی تو کوئی بات نہیں ہے ہم دوسری گاڑی کا انتظار کر لیں گے۔'' اس نے دوبارہ بکنگ کلرک کے جذبات سے کھیلتے ہوئے شائستہ لہجے میں کہا۔

بکنگ کلرک کھسیانہ ہو کر بولا۔ ''نہیں بابا جی آپ کو دوسری گاڑی کا انتظار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کو اسی گاڑی میں سیٹ ملے گی۔''

اتنا کہہ کر اس نے جلدی سے ایک ٹکٹ کاٹا اور اس کے حوالے کر دیا۔

ادھیڑ عمر شخص نے ٹکٹ لیا اور جیب سے چند نوٹ نکال کر بکنگ کلرک کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ پھر اپنا تھیلا سنبھالتا ہوا کوسٹر کی طرف چل دیا۔ ٹکٹ پر اس کا سیٹ نمبر کوسٹر کی آخری رو میں تھا۔ اس نے بکنگ کلرک کو کرایے کے لیے جو رقم دی تھی وہ پندرہ کی بجائے بیس روپے کم تھی۔

کوسٹر میں کچھ سواریاں پہلے سے موجود تھیں اور جو چند ایک بس اسٹاپ پر گھوم رہی تھیں وہ ڈرائیور کے بیٹھنے اور گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بعد بھاگ بھاگ کر اپنی اپنی نشست پر پہنچنے لگیں۔ چند لمحوں میں کوسٹر سواریوں سے کھچا کھچ بھر گئی۔

جس وقت کوسٹر رینگتی ہوئی بس اسٹاپ سے باہر نکل رہی تھی اس وقت سورج تقریباً غروب ہونے والا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر شخص اپنا بوسیدہ تھیلا گود میں رکھے آنکھیں موند کر بڑے آرام سے اونگھ رہا تھا کسی سواری نے اس کی طرف متوجہ ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

بس اسٹاپ سے نکل کر کوسٹر مین روڈ پر پہنچ گئی۔ ڈرائیور گیئر پر گیئر بدلتا گیا اور رفتہ رفتہ کوسٹر کی سپیڈ بڑھتی گئی۔ چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ڈرائیور نے کوسٹر کی تمام

اندرونی لائٹس آف کردیں اور کیسٹ پلیئر میں ایک کیسٹ ڈال دی۔ آٹو میٹک کیسٹ پلیئر خود بخود آن ہوگیا اور کوسٹر میں انڈیا گانوں کی دھیمی دھیمی آواز گونجنے لگی۔

رات کے کھانے کے لیے ڈرائیور نے اپنے منتخب شدہ ہوٹل کے سامنے تقریباً نو بجے کوسٹر روکی اور اونگھتی جاگتی سواریاں آہستہ آہستہ نیچے اترنے لیں البتہ وہ ادھیڑ عمر شخص اپنا بوسیدہ تھیلا گود میں رکھے بڑے مزے کے ساتھ خراٹے لیے جا رہا تھا کسی سواری نے بھی اسے جگانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

کھانے پر تقریباً آدھا گھنٹہ صرف کرنے کے بعد کوسٹر دوبارہ اپنی منزل کی جانب روانہ ہوگئی۔

اس وقت شاید کوئی آدمی رات کا عمل ہوگا جب اچانک کوسٹر ایک جھٹکے کے ساتھ رکا اور رات کی پراسرار خاموش تاریکی کی چرچراہٹ سے مرتعش ہو کر رہ گئی۔

تمام سواریاں ہڑبڑا کر جاگ اٹھیں۔ جھٹکا لگنے سے چند سواریوں کے سر بھی ایک دوسرے سے ٹکرا گئے تھے۔

اس کوسٹر میں سوار مسافروں کے حواس بھی بحال نہیں ہوئے تھے کہ آندھی اور طوفان کی طرح جدید اسلحے سے مسلح چھ نوجوان کوسٹر میں داخل ہوگئے جن کے چہروں پر سیاہ رنگ کے نقاب کچھ اس طرح چڑھے ہوئے تھے کہ بمشکل ان کی آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔

ڈرائیور نے بریک لگاتے ہی فوراً کوسٹر کی اندرونی لائٹس آن کر دی تھیں۔ نقاب پوشوں کا سرغنہ دندناتا ہوا ڈرائیور کے سر پر پہنچا اور بارعب آواز میں بولا۔ ''سنو! کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔''

ڈرائیور جس کے چہرے پر خوف اور دہشت کے مارے ہوائیاں اڑ رہی تھیں صرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

'' چلو گاڑی کو سڑک سے اتار کر بائیں طرف والے کچے راستے پر ڈال دو۔ '' ڈاکوؤں کا سرغنہ دوبارہ غراہٹ آمیز آواز میں بولا اور تمام سواریوں کو سانپ سونگھ گیا۔

ڈرائیور نے بلا تردد اس کے حکم کی تعمیل کی اور کوسٹر کو سڑک سے اتار کر کچے راستے پر ڈال دیا۔ اونچے نیچے کچے راستے پر کوسٹر ڈگمگاتی ہوئی آخرکار درختوں کے ایک جھنڈ میں جا کر رک گئی۔ درختوں کے اس جھنڈ میں کھلی جگہ پر چاند کی روشنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک

رہی تھی۔ کوسٹر کے رکتے ہی نقاب پوش دوبارہ بولا۔ '' چلو تمام لوگ شرافت سے نیچے اتار کر دو لائنوں میں ہاتھ اوپر کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ کسی شخص نے بھی اگر ذرا سی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو وہ اپنی موت کا ذمہ دار خود ہوگا۔''

تمام مسافر برق رفتاری سے نیچے اترنے لگے چشم زدن میں ساری کوسٹر خالی ہوگئی۔

''اب شرافت سے تمام لوگ دو لائنیں بنا لو، ایک میں مرد حضرات کھڑے ہو جائیں اور دوسری لائن میں عورتیں۔ شاباش جلدی کرو یہ نہ ہو کہ لاشیں گرنا شروع ہو جائیں۔ سرغنہ نے سواریوں کے نیچے اترنے کے بعد نیا حکم صادر کیا۔

تمام مسافر خوف و دہشت سے سہمے گرتے پڑتے دو لائنوں میں کھڑے ہوگئے۔

بعض عورتوں کے منہ سے دبی دبی چیخیں نکل رہی تھیں مگر لٹیروں نے کسی کی طرف توجہ نہ دی۔

اچانک ایک بچہ زور زور سے رونے لگا اور اس کی آواز رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی دور دور تک پھیلنے لگی۔ بچے کی ماں خوف اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں مبتلا ہو کر اسے بہلانے کی کوشش کرنے لگی مگر بچہ کسی طرح بھی چپ نہیں ہو رہا تھا۔

یہ صورتحال دیکھ کر ایک نقاب پوش جھنجھلا کر رونے والے بچے کی ماں کے پاس پہنچا اور گرج کر بولا۔ '' چپ کراؤ اس حرامی کو نہیں تو ابھی بھون ڈالوں گا۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی آٹو میٹک گن کو ہوا میں لہرایا۔

''وہ ..... وہ..... جج.... جی. ... بچہ ہے ناں..... اس لیے چپ... نہیں ہو رہا۔''

بچے کی ماں کے منہ سے بمشکل چند لفظ نکلے۔

''ارے خاتون! بچے کے منہ پر ہاتھ رکھ دو، اس منحوس کی آواز بہت دور تک جا رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ ہم سب کی بربادی کا سبب بن جائے۔'' ڈاکوؤں کا سرغنہ ان دونوں کے قریب پہنچ کر حتی الوسع نرم لہجے میں بولا۔

''جی ..... جی اس طرح تو بچہ دم گھٹنے سے مر جائے گا۔'' اس بار اس کے لہجے سے اعتماد جھلک رہا تھا ماں تھی نا۔

دنیا کی ہر ماں اپنی اولاد کی خاطر دنیا کے بڑے بڑے فرعونوں کے سامنے ڈٹ جاتی ہے، ممتا اسی جذبے کا نام ہے۔

سرغنہ کو عورت کا یہ جواب شدید ناگوار گزرا مگر اس سے پہلے کہ وہ عورت کو جھڑکتا یا

اسے کوئی ہاتھ جاتا اچانک اسے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا بوجھ محسوس ہوا۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر غلیظ اور کمزور سے شخص کو موجود پایا۔

''کیا تکلیف ہے بڑے میاں! کیا زندگی سے اکتا چکے ہوں یا پھر خودکشی کرنے کا شوق ہے؟'' اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''برخوردار! زندگی تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ تمہیں خود اپنی زندگی کے بارے میں کچھ معلوم ہے جو مجھ سے اس طرح کے سوال کر رہے ہو؟'' ادھیڑ عمر شخص شائستہ لہجے میں بولا۔

''جاؤ بابا جاؤ لائن میں جا کر اپنی جگہ آرام سے کھڑے ہو جاؤ نہیں تو ؟'' وہ فقرا ادھورا چھوڑ کر آٹومیٹنگ گن کا سیفٹی کیچ ہٹا کر غرایا۔

''نہیں تو تم مجھے مار ڈالو گے، یہی کہنا چاہتے ہو نا؟'' ادھیڑ عمر شخص نے بے خوف ہو کر پوچھا۔

''ارے بڈھے کھوسٹ تیری تو.....؟''

اس نے ادھیڑ عمر شخص کو ایک فحش گالی دے کر اس پر گن تان لی۔

وہاں موجود تمام مردوں کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور عورتوں نے خوف اور دہشت کے مارے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ان تمام کے کان فائر کی آواز اور اس ضعیف شخص کی چیخ سننے کے منتظر تھے جو خواہ مخواہ ان درندہ صفت ڈاکوؤں سے الجھ پڑا تھا۔

سرغنہ نے جونہی اس پر گن تانی وہ بارعب لہجے میں بولا۔

''چلاؤ گولی اگر ماں کا دودھ پایا ہے تو، میں بھی دیکھوں کہ تم کتنے بہادر ہو۔''

نجانے یہ اس کی آواز کی تاثیر تھی یا کوئی جادو کیونکہ سرغنہ کے ہاتھ واضح طور پر کانپ رہے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ وہ ٹرائیگر دبا سکتا۔ اس کی رگ و پے میں ایک نامعلوم قسم کا خوف سرایت کر گیا تھا ایک ایسا خوف جس کے متعلق وہ انجان تھا۔

وہاں موجود تمام لوگ خوف اور تحیر کی ملی جلی کیفیت میں ان دونوں کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے۔

اچانک بقیہ پانچ نقاب پوشوں میں سے ایک آگے بڑھ کر بولا۔ ''باس! کیا سوچ رہے ہو؟ مارو سالے کو گولی اور قصہ ختم کرو۔ ہم یہاں ان سے مذاکرات کرنے کے لیے تو نہیں

آئے ہیں۔''

مگر جب باس کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ دوبارہ بولا۔

''باس کیا ہوا...؟''

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی ان دیکھی قوت نے سختی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو خوف کی شدت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور گن میکانکی انداز میں اس کے ہاتھوں سے نکل کر ہوا میں تیرتی ہوئی اس ادھیڑ عمر پراسرار شخص کے سامنے جا کر فضاء میں رک گئی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر گن کو پکڑا اور سرغنہ کی طرف تان کر پاٹ دار آواز میں بولا۔

''گولی چلاؤ مجھ پر نہیں تو میں پورا برسٹ تمہاری چھاتی میں اتار دوں گا۔''

سرغنہ نے طیش میں آ کر دوبارہ ہاتھ کو ٹرائیگر کی طرف بڑھانا چاہا مگر اب کی بار تو اس کے دونوں ہاتھ رائفل کے بٹ سے اس طرح چپٹ کر رہ گئے جیسے کسی نے میجک اسٹون لگا کر انہیں بٹ سے جوڑ دیا ہو۔ اس نے بولنے کی کوشش کی تو اس کے دونوں لب آپس میں جڑ گئے اور آنکھوں میں خوف و ہراس کے سائے لہرانے لگے۔

ایک لمحے میں ساری سچویشن تبدیل ہو گئی۔ چند لمحے پہلے ڈاکو بڑے رعب اور طنطنے کے ساتھ مسافروں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک رہے تھے اب اپنی اپنی جگہ پر پتھر کے بت بن کر کے کھڑے تھے نہ تو وہ اپنی جگہ سے ہل سکتے تھے اور نہ ہی اپنی زبان سمیت جسم کے کسی عضو کو حرکت دے سکتے تھے۔

البتہ ان کی رائفلیں ان کے ہاتھوں میں موجود تھیں۔ سوائے اس ایک نقاب پوش کے جس کی رائفل اب اس ادھیڑ عمر شخص کے ہاتھ میں تھی جس نے ان سب کو زندہ لاشوں میں تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔

سرغنہ سے نگاہیں ہٹا کر اس ادھیڑ عمر شخص نے کوسٹر کے ڈرائیور کی طرف دیکھا اور نرم لہجے میں بولا۔ ''میاں تم ایسا کرو کہ تمام سواریوں کو گاڑی میں بیٹھا دو اور گاڑی کو مین روڈ کی طرف لے جاؤ۔ میرے پاس صرف چھ نوجوان چھوڑ کر جاؤ جو ان ناسوروں کا بوجھ اٹھا سکیں۔ ہم جلدی ہی آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔''

ڈرائیور نے اس کی بات سن کر اثبات میں سر ہلایا اور مسافروں کو کوسٹر میں سوار

ہونے کا اشارہ کر دیا۔

پانچ منٹ کے بعد کوسٹر سواریوں کو لے کر دوبارہ مین روڈ کی طرف جا رہی تھی۔ ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ نقاب پوشوں کے علاوہ سواریوں میں سے چھ نوجوان رہ گئے تھے۔

میدان خالی ہوتے ہی وہ ادھیڑ عمر شخص زیر لب کچھ بڑبڑایا اور تمام نقاب پوشوں کے جڑے ہوئے لب کھل گئے۔

اس کے بعد وہ پروقار انداز میں چلتا ہوا ڈاکوؤں کے سرغنہ کے قریب پہنچا اور سرد لہجے میں بولا۔ ''ایک ہی سانس میں اپنا نام مع اپنے جرائم کے بتاؤ، اگر ذرا بھی جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو اس گن کی تمام گولیاں تمہارے سینے میں اتار دوں گا۔''

اس کی بات سن کر سرغنہ نہ چاہتے ہوئے بھی سچ بولنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے اپنا نام دلاور بتایا اور دوسرے پانچویں نقاب پوش اس کے ساتھی تھے۔ وہ سب مل کر اب تک پچاس کے قریب ڈکیتی کی وارداتیں کر چکے تھے اور تقریباً پندرہ بے گناہ افراد کو موت کے گھاٹ اتار چکے تھے۔ پولیس بڑی سرگرمی کے ساتھ ان سب کی تلاش میں مصروف تھی لیکن آج تک ان کا سراغ لگانے میں ناکام رہی تھی۔

ان کا اقبال جرم سننے کے بعد وہ ادھیڑ عمر شخص حتمی انداز میں بولا۔ ''تم خدا کی زمین پر بہت من مانی کر چکے ہو۔ بے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار کر تم نے اوپر والے کے غضب کو للکارا ہے۔ ظلم کی رسی بہت دراز سہی لیکن اس کا انجام ہمیشہ ایک بھیانک موت پر ہوتا ہے۔ انسان جوانی کے جوش میں دوسروں کے خون سے ہولی کھیلتے ہوئے بھی یہ نہیں سوچتا کہ وہ بھی گوشت پوست سے بنا ہوا ہے انہی کی مانند ایک فانی انسان ہے۔ آج تمہاری موت کے پروانے پر دستخط ہو چکے ہیں۔ لیکن تمہارے گندے خون سے کوئی بھی ذی شعور انسان اپنے ہاتھ خراب کرنا نہیں چاہے گا۔ لہٰذا تم سب اپنے ہاتھوں سے اپنا خون کرو گے۔''

اتنا کہہ کر اس نے نہتے نقاب پوش کو گن واپس لوٹا دی اور خود ان سے چند قدم کے فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

اب وہ دوبارہ زیر لب کچھ بڑبڑایا۔ اچانک تمام نقاب پوشوں کی رائفلیں میکانکی انداز میں ان کی کنپٹیوں سے جا لگیں ہاتھ ان کے تھے لیکن انہیں حرکت میں لانے والی قوت کوئی اور تھی۔ کوئی ایسی غیر مرئی طاقت جو ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو کر بھی انہیں اپنی بات

منوانے پر مجبور کر رہی تھی۔

پھر ان کے دیکھتے ہی دیکھتے بیک وقت چھ فائر ہوئے اور رات کا سناٹا تھرا کر رہ گیا۔ ان نقاب پوشوں کو چیخنے کی مہلت بھی نہ مل سکی۔ چند لمحے پہلے وہ جیتے جاگتے انسان تھے مگر اب لاشوں میں تبدیل ہو کر زمین پر پڑے ہوئے تھے۔

نقاب پوشوں کے جہنم واصل ہوتے ہی وہ پراسرار شخص ان چھ مسافروں کی طرف متوجہ ہو گیا جو اپنی اپنی جگہ پر سن ہو کر رہ گئے تھے شاید اس سے قبل ان میں سے کسی کی آنکھوں نے ایسا تحیر آمیز نظارہ نہیں دیکھا تھا۔

بڑی مشکل سے اس نے چھ نوجوانوں کی ڈھارس بندھائی اور انہیں ڈاکوؤں کی لاشیں اٹھانے پر راضی کیا۔

انہوں نے ڈرتے ڈرتے ڈاکوؤں کی لاشیں کندھوں پر رکھیں اور اس پراسرار شخص کے پیچھے پیچھے مین روڈ کی طرف چل پڑے۔ تمام ڈاکوؤں کی رائفلیں پراسرار شخص نے اٹھا رکھی تھی۔

تقریباً دس منٹ کے بعد کوسٹر دوبارہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو چکی تھی لیکن اب کی بار اس میں سواروں کے علاوہ چھ لاشیں بھی موجود تھیں جو کوسٹر کے درمیان خالی جگہ پر الٹی سیدھی دھری ہوئی تھیں ان کی گنیں بھی ان کے ساتھ ہی رکھ دی گئی تھیں۔

کوسٹر میں تھوڑی دیر تک تو ایک جان لیوا خاموشی چھائی رہی مگر پھر آہستہ آہستہ سواریاں آپس میں دبی دبی زبان میں گفتگو کرنے لگیں اور ماحول کی کشیدگی بڑی حد تک کم ہو گئی۔

کوسٹر میں سوار لوگ اس ادھیڑ عمر شخص کو تحیر اور عقیدت کی ملی جلی نظروں سے دیکھ رہے تھے ان کے لیے وہ کسی دیوتا سے کم نہیں تھا جس نے بروقت مداخلت کر کے انہیں لٹنے کے ساتھ ساتھ بے عزت ہونے سے بھی بچا لیا تھا۔

صبح سویرے سورج نکلنے سے چند لمحے پہلے کوسٹر ملتان شہر میں داخل ہوئی تو اس وقت سوائے ڈرائیور کے تمام سواریاں نیند میں مدہوش ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہی تھیں۔

شہر میں داخل ہوتے ہی ڈرائیور نے سیدھا سٹی تھانے کا رخ کیا۔ چند لمحے بعد کوسٹر تھانے کے مین گیٹ کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ ڈرائیور نے ڈیوٹی پر موجود سنتری کو جب مختصر

الفاظ میں تمام واقعہ سنایا تو وہ تقریباً بھاگتا ہوا تھانے کے اندر داخل ہو گیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے پورے تھانے میں افراتفری مچ گئی۔ ڈاکوؤں کی لاشیں تحویل میں لینے کے بعد ایک انسپکٹر سواریوں سے باری باری تفتیشی انداز میں انٹرویو لینے لگا۔ ہر مسافر نے تقریباً ایک جیسا ہی بیان دیا لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ وہ پراسرار شخص گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو چکا تھا اور انسپکٹر بغیر اس سے ملے کسی طرح بھی یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ ان ڈاکوؤں نے ایک پراسرار شخص کی وجہ سے اپنے آپ کو گولی ماردی ہے۔

لیکن ہر سواری کا یہی بیان تھا کہ یہ سب کچھ ایک عجیب اور پراسرار شخص کی وجہ سے ہوا ہے جو نجانے کہاں غائب ہو گیا ہے۔

آخر کار نہ چاہتے ہوئے بھی انسپکٹر نے ایک گمنام قاتل کے خلاف ایف آئی آر درج کر دی اور مسافروں کے بتائے گئے حلیے کے مطابق شہر میں قاتل کی تلاش شروع کر دی مگر چھ ماہ گزرنے کے باوجود پولیس اس کا کوئی سراغ نہ لگا سکی۔ البتہ اس عرصے کے دوران وہ ریڑھی بان اور بکنگ کلرک جن کا واسطہ اس پراسرار شخص سے پڑ چکا تھا۔ حیرت انگیز طور پر خاصے دولت مند ہو چکے تھے۔ ریڑھی بان نے اب اپنا ایک متوسط درجے کا ہوٹل خرید لیا تھا اور بکنگ کلرک ایک کوسٹر کا مالک بن چکا تھا۔ اب خدا معلوم کہ ان کا یہ کایا پلٹ کس کی مرہون منت تھی۔



پورا سچ

شنکر سے میری واقفیت کوکہ اتنی پرانی نہیں تھی لیکن گوا شہر کی جس کالونی میں ہم دونوں رہائش پذیر تھے وہاں ہم دونوں کا ذکر ایک جان دو قلب کے نام سے کیا جاتا تھا اور حقیقت بھی یہی تھی کیوں کہ ہم دونوں ہم نام ہونے کے ساتھ ساتھ شکل وصورت میں بھی ایک جیسے تھے۔ ہم دونوں کی شکل میں جو انیس بیس کا فرق تھا اس کی کسر ہمارے ناموں نے پوری کر دی تھی۔

کرشن کالونی کافی بڑی تھی۔ وہاں تقریباً ضرورت کی ہر شے باآسانی دستیاب ہو جاتی تھی۔ وہاں رہائش پذیر لوگ زیادہ تر متوسط طبقے سے تھے۔ چند ایک سرمایہ دار بھی تھے جنہوں نے کالونی میں اپنی اپنی صنعتیں لگا رکھی تھیں۔ کالونی میں موجود چند مارکیٹیں کافی بارونق تھیں اس لیے میرا اور شنکر کا کام بڑی آسانی کے ساتھ چل رہا تھا۔

آپ شاید یہ سن کر حیران ہوں گے کہ میرا اور شنکر کا تعلق موجودہ دور کے ان نوجوانوں سے ہے جو آدھا دن لڑکیوں کے پیچھے جوتے چٹخاتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔ باقی کا آدھا دن چوری چکاری اور مار دھاڑ، جس میں پاکٹ مارنا بھی شامل ہے۔ گزارنے کے بعد رات کو باقاعدہ دستیاب گزر کرتے ہوئے بصورت دیگر اگر جیب خالی ہو تو پھر کوئی سستا سا سگریٹ پھونک کر اپنی جان جلانے کے ساتھ ساتھ سماج کے اونچے طبقے کو من پسند گالیوں سے نوازتے رہتے ہیں۔ ہاں جس دن ہم دونوں ذرا لمبا ہاتھ مارتے تھے اس دن پینے پلانے کا شغل بھی فرما لیا کرتے تھے۔

شنکر سے میری دوستی ایک سال قبل ممبئی جیل میں ہوئی تھی۔ وہ بھی میری طرح جیب تراشی کے جرم میں قید ہوا تھا ہم دونوں کو چھ چھ ماہ کی قید بامشقت ہوئی تھی۔

ہم شکل اور ہم نام ہونے کی وجہ سے ہم دونوں نہایت ہی سرعت کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے اور پھر جیل کے قیدیوں نے ہمیں ایک جان دو قلب کا خطاب دے ڈالا تھا۔ شیکھر مجھ سے صرف پندرہ دن پہلے رہا ہو گیا تھا۔ رہا ہوتے وقت اس نے مجھے گلے سے لگا کر خوب بھینچا تھا اور پھر میری پشت تھپکتے ہوئے بولا تھا۔ "دوست! چنتا مت کرنا، میں ہر دوسرے دن تیری ملاقات کو آیا کروں گا اور جس دن تیری رہائی ہوگی اس دن میں موتیے کے ہار لے کر جیل کے گیٹ پر تیرا سواگت کروں گا۔"

اور پھر شیکھر نے جیسا کہا تھا، اسے عملاً ثابت کر دکھایا تھا۔ بلاشبہ شیکھر ایک بہترین اور دوست نواز نوجوان تھا۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد میرے پاس رہنے کا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں تھا لیکن شیکھر نے میرا یہ مسئلہ بھی حل کر دیا تھا۔ وہ مجھے گوا شہر سے چند کلومیٹر دور کرشن کالونی میں لے آیا تھا جہاں اس کا اپنا ایک چھوٹا سا خوبصورت فلیٹ تھا جو دو کمروں اور ایک عدد کچن پر مشتمل تھا۔ ایک کمرے کو ہم خواب گاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے اور دوسرا کمرہ ایک طرح کا ڈرائنگ روم تھا۔ جس میں کھانے پینے کے سامان کے علاوہ بعض اوقات ملکی اور غیر ملکی شراب کی بھی کوئی نہ کوئی بوتل موجود رہتی تھی۔

میری طرح شیکھر کا بچپن بھی اناتھ آشرم میں گزرا تھا۔ اس کا بھی میری طرح سنسار میں کوئی نہیں تھا۔ نہ مجھے اپنا ماتا پتا کی کوئی خبر تھی اور نہ ہی شیکھر کو۔ قدرت نے شاید ہمیں نام اور شکل وصورت ایک جیسی دینے کے ساتھ ساتھ تقدیر بھی ایک جیسی دی تھی۔ اناتھ آشرم میں ہمیں جو واجبی سی تعلیم دی گئی تھی اس سے صرف اتنا ہوا تھا کہ ہم اردو اور ہندی لکھ پڑھ لیتے تھے البتہ ہمارے بولنے کا اسٹائل غنڈے موالیوں والا تھا۔

ایک رات اپنے فلیٹ میں جب ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر خوب جی بھر کر پی رہے تھے اور ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ نہ جانے شیکھر کے جی میں کیا سمائی، بڑے اداس لہجے میں بولا۔ "یار شیکھر! یہ اوپر والے کو کیا سوجھی، سالا ہم دونوں کو ایک جیسا بنا ڈالا اور پھر یہ سالی تقدیر بھی ایک جیسی، نام بھی ایک جیسا۔ اپن کو سالا ڈر لگتا ہے کہ کسی دن ہم دونوں ایک ساتھ کھلاس ہو جائے۔"

"تو ہونے دے نا! سالا چنتا کاہے کو کرتا ہے۔" میں نے ہنس کر جواب دیا۔

اس نے لمحہ بھر کے لیے میری طرف دیکھا اور بدستور افسردہ لہجے میں بولا۔ "تو نہیں

سمجھے گا سالہ پنوری، اگر ہم دونوں ایک ساتھ کھلاس ہو گیا تو پھر اپنی چتا کون جلائے گا۔"

"سالا میں پنوری ہوں تو تو کون سا بیرسٹر ہے۔ سڑک چھاپ کھالی پیلی ٹیم مت کھر اب کر، لے دارو پی اور موج مستی کر۔" میں نے دارو کی بوتل اٹھا کر اس کا خالی گلاس بھرنا شروع کر دیا۔

"تو سمجھتا کاہے کو نہیں یار! میرے کو اور دارو نہیں پینے کا۔"

اس نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

"دیکھ دارو نہیں پینے کا تو مت پی لیکن یہ چھوکری لوگ کا مافک تھوبڑا کاہے کو بناتا ہے۔" میں نے اس کے سامنے سے گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تیرے کو ایک بات بولوں شیکھر!" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ "میرے کو کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ ہم دونوں ایک ساتھ جائیں گے دنیا سے، پچھلی بار کی طرح۔"

"اے سالا پنوری! چڑھ گئی رے تیرے کو، تو کیا کام سے۔ یہ کیا اگلی پچھلی بار بولتا ہے۔ سالا کرن ارجن کی اسٹوری سے اپن کا کیا واسطہ۔"

اس نے میری بات کا برا منائے بغیر جواب دیا۔

"اپن کو ایسا اچھا لگتا ہے رے تو سالا سوچتا نہیں ہے ناں اس لیے تیرے کو چنتا بھی نہیں ہے پر دیکھنا اپن دونوں ایک ساتھ کھلاس ہوگا۔"

"چل ابھی بک بک مت کرنے کا جب اترے گی تو تیرے کو ایسا ویسا کچھ نہیں لگے گا۔" میں نے شیکھر کی مزید بک بک سننے کی بجائے کچن کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

عقب سے مجھے شیکھر کی دھیمی دھیمی بڑبڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ جب بھی اسے چڑھتی تھی وہ ایسی ہی الٹی سیدھی ہانکتا تھا۔ اس کی اکثر باتیں پچھلے جنم سے متعلق ہوتی تھیں کہ ہم پہلے بھی ایک بار دنیا میں آئے تھے اور اسی طرح ایک دوسرے کے دوست تھے، ہم شکل تھے لیکن ہم نام نہیں تھے اور ایک ہی دن دنیا سے کوچ کر گئے تھے لیکن مجھے ایسا کچھ یاد نہیں پڑتا تھا اس لیے میں شیکھر کی ان باتوں کو ان کے بہک جانے پر محمول کرتا تھا۔

☆☆☆

پچھلے چند دنوں سے ہم بہت ابتر زندگی گزار رہے تھے۔ ہم دونوں کی جیب میں سوائے سگریٹ اور ماچس کی ڈبیا کے کچھ بھی نہیں تھا۔ دونوں ٹائم کا کھانا بھی ایک ڈھابہ ہوٹل

سے ادھار کھا رہے تھے۔ اگر ہوٹل کا مالک ہم دونوں کا دیرینہ واقف کار نہ ہوتا تو شاید ہمیں فاقے کرنے پڑ جاتے۔

ہفتے کی رات جب ہم دونوں ہوٹل سے کھانا کھا کر واپس فلیٹ میں پہنچے تو شیکھر کافی پریشان لگ رہا تھا۔ میں نے اس کی اتری ہوئی شکل دیکھ کر کہا۔ ''اے کاہے کو پریشان ہوتا ہے رے، یہ اچھا برا ٹیم تو سالا چلتا رہتا ہے۔ آج نہیں تو کل اپن لوگ کہیں بڑا ہاتھ مار لیں گے۔''

''یہی تو اپن سوچ رہے ہیں سالا لائف گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔''

''تو سوچ ناں سالا تیرے کو روکا کس نے ہے؟'' میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

میری بات سن کر اس نے چند لمحوں کے لیے چپ سادھ لی شاید وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ میں ایک ٹک اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں وہی مخصوص چمک لہراتی نظر آئی جو اس کی آنکھوں میں اکثر اس وقت نظر آیا کرتی تھی جب وہ کوئی بہترین منصوبہ سوچنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

''شیکھر، کیا تیرے کو آج رات لاکھ پتی بننے کا ہے؟'' اس نے جواب طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اے سالا سڑک چھاپ! کیا بولتا ہے رے۔ کیا بینک میں ڈاکا مارنے کو ہے؟''

''کیا اپن ایسا بولا۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''تو پھر کیا سالا بھیک مانگ کر لکھ پتی بننے کا ہے۔'' میں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

''دیکھ شیکھر!'' وہ میرا مذاق نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''میری بات غور سے سننے کا ہے۔ بیچ میں نوکنے کا نئیں۔ کل سنڈے ہے اور فروری کی پہلی۔ تو سیٹھ دھن راج کو جانتا ہے ناں! وہی جس کی یہاں کالونی میں صابن کی فیکٹری ہے؟''

اس کا انداز سوالیہ تھا لہٰذا جب میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ دوبارہ گویا ہوا۔ ''سنڈے کی چھٹی اپن لوگ کے لیے خوش قسمتی کی بات ہے۔ پرسوں سیٹھ دھن راج

فیکٹری کے ملازم لوگوں کو پگار دیگا۔ تو اس کا مطلب ہے کہ آج رات سیٹھ دھن راج کی تجوری میں کم سے کم پندرہ بیس لاکھ روپے کیش کی صورت میں موجود ہوں گے۔''

''تو کیا وہاں ڈاکا مارنے کا ہے؟'' اس کے خاموش ہوتے ہی اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''تو اور کیا پھوکٹ میں لکھ پتی بننے کا ہے تیرے کو؟'' اس نے غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''یہ کام تیرے کو آسان دکھتا ہے سالا، اس میں اپن لوگ کا مرڈر بھی ہو سکتا ہے۔'' میں نے ممکنہ خطرے کی طرف اس کی توجہ دلاتے ہوئے جواب دیا

''ارے سالا کائر۔ ڈرتا کاہے کو ہے، اپن ہے نا تیرے ساتھ۔ ادھر کوٹھی میں صرف ایک گن مین ہوتا ہے اور پھر اپن لوگ خالی ہاتھ تھوڑی جائیں گے ادھر، تیرے کو بس، ذرا ہمت کرنے کا ہے اور اس کے بعد اپن لوگ ہمیشہ کے لیے اس ٹچوریوں والی زندگی کو چھوڑ دیں گے۔ ممبئی جا کر کوئی کام دھندا شروع کر دیں گے۔'' اس نے میری ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔

آخر کار ایک گھنٹے کی مغز ماری کے بعد اس نے مجھے سیٹھ دھن راج کی کوٹھی میں ڈاکا ڈالنے کے لیے قائل کر لیا۔

رات کے تقریباً بارہ بجے کے بعد ہم دونوں مسلح ہو کر فلیٹ سے باہر نکلے تو کرشن کالونی میں مکمل خاموشی کا راج تھا۔ صرف کبھی کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آتی اور رات کے سناٹے کو لمحہ بھر کے لیے مرتعش کرنے کے بعد فضاء میں معدوم ہو جاتی۔

تقریباً بیس، پچیس منٹ کے بعد ہم کسی خطرے کا سامنے کیے بغیر دھن راج کی عالی شان کوٹھی کے سامنے پہنچ گئے۔ کوٹھی میں بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شاید گھر کے مکین محو خواب تھے البتہ کوٹھی کی تمام بیرونی لائٹس آن تھیں جس کی وجہ سے کوٹھی کا سامنے کا حصہ روشن نظر آ رہا تھا۔

سامنے سے کوٹھی میں داخل ہونا تقریباً ناممکن تھا اس لیے جب شیکھر نے مجھے کوٹھی کے پچھلی طرف سے اندر داخل ہونے کا مشورہ دیا تو بلا تردد اس کی بات سے اتفاق کیا۔ ہم دونوں دبے پاؤں چلتے ہوئے کوٹھی کے عقب میں پہنچ گئے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہماری توقع کے عین مطابق کوٹھی کی عقبی طرف سے لوہے کا ایک مضبوط پائپ زمین سے اوپر کوٹھی کی

چھت کی طرف جا رہا تھا۔

ذرا سی کوشش کے بعد ہم دونوں پائپ کے ذریعے کوٹھی کی چھت پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ کسی بھی ممکنہ خطرے سے نمٹنے کے لیے ہم دونوں کے ہاتھ میں پستول موجود تھے، اس کے علاوہ ہمارے چہرے سیاہ نقاب کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ اگرچہ ہم دونوں سیٹھ دھن راج کے لیے قطعی اجنبی تھے لیکن پھر بھی ہم کسی قسم کا رسک لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔

کوٹھی کی چھت پر پہنچنے کے بعد ہم نے ذرا سی کوشش سے نیچے جانے والی سیڑھیاں تلاش کر لیں۔ یہ سیڑھیاں کوٹھی کی چھت سے سیدھی برآمدے کے کونے میں اترتی تھیں۔ ہم دونوں دبے پاؤں تنگ سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے برآمدے میں پہنچ گئے۔ سامنے تقریباً پچیس گز کے فاصلے پر کوٹھی کا مین گیٹ نظر آ رہا تھا۔ گن مین گیٹ کے ایک طرف کرسی ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔

پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کسی بلی کی طرح دبے پاؤں چلتا ہوا گن مین کے سر پر پہنچ گیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا کیونکہ اس قسم کی سچویشن سے میرا واسطہ پہلی بار پڑا تھا۔ میں لاکھ بہادر سہی لیکن پاکٹ مارنے اور ڈاکا ڈالنے میں بہت فرق ہے۔

دوسرے لمحے شیکھر نے بے خبر گن مین کے سر پر زور سے پستول کا دستہ مارا اور وہ کرسی سے لڑھک کر نیچے گر گیا۔ شیکھر نے گرتے ہوئے گن مین کی نبض چیک کی اور پھر مطمئن انداز میں چلتا ہوا میرے قریب پہنچ گیا۔

”گن مین سالا تو گیا کام سے۔“ اس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”اے سالا تو نے اسے کہیں کلاس تو نہیں کر دیا؟“ میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”نکو رے صرف دو گھنٹے کے لیے بے ہوش کیا ہے۔ چل ابھی زیادہ بات نہیں کرنے کا، سیٹھ دھن راج کا تجوری اپن لوگ کا ویٹ کرتا ہوگا“ اس نے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

ذرا سی تگ و دو کے بعد ہم نے سیٹھ دھن راج کی خواب گاہ تلاش کر لی لیکن خواب گاہ کا دروازہ کھولنے کے لیے مجھے اور شیکھر کو بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا پڑا تھا۔ خوش قسمتی سے بروقت شیکھر کے دماغ میں ایک ترکیب آ گئی ورنہ ہمیں خالی ہاتھ واپس لوٹنا پڑتا۔

فیکٹری میں آگ لگنے کی خبر سن کر سیٹھ دھن رج نے بڑا تردد اپنی خواب گاہ کا دروازہ

کھول دیا۔ میں اور شیکھر دندناتے ہوئے خواب گاہ میں داخل ہوئے اور سیٹھ دھن راج اور اس کی نوجوان بیوی کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ موت کو اپنے سامنے دیکھ کر ان دونوں کی سٹی گم ہو گئی۔

تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد میں اور شیکھر دوبارہ اسی لوہے کے پائپ کے ذریعے کوٹھی سے باہر نکل رہے تھے۔ شیکھر کے ہاتھ میں نئے کرنسی نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ موجود تھا جس میں لگ بھگ پندرہ لاکھ روپے کی رقم تھی۔ سیٹھ دھن راج اور اس کی بیوی کو ہم نے خواب گاہ کے اندر باندھ کر ڈالنے کے لیے بعد باہر سے کنڈی لگا دی تھی۔ اس لیے ہمیں فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں تھا۔

فلیٹ میں پہنچنے کے بعد شیکھر مارے خوشی کے ناچنے لگا۔ ”ارے شیکھر، سالا چوری اپن لوگ لکھ پتی بن گیا رے، ادھر آ تو بھی ناچ اپن کے ساتھ...... یہ...... دیکھ سالا نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ یہ سب اپن لوگ کا ہے۔“ وہ بیگ کو زور زور سے تھپکتے ہوئے بولا۔

شیکھر کو خوشی کی حالت میں پاگلوں کی طرح ناچتے ہوئے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو میں لاشعوری طور پر حیرت زدہ رہ گیا مگر دوسرے ہی لمحے مجھے اپنے دماغ پر ایک ناقابل برداشت بوجھ محسوس ہوا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ شیکھر کا خوشی سے جھومتا لہراتا وجود آہستہ آہستہ میری نگاہوں میں دھندلانے لگا حتیٰ کہ وہ بالکل نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری بینائی مکمل طور پر چلی گئی ہو۔ خوف کی شدت سے دل میرے پہلو میں پارے کی طرح اچھل رہا تھا۔ شاید میں موت کے منہ میں جا رہا تھا لیکن نہیں میں تو زندہ تھا۔ میں نے اپنے بدن کو ہاتھوں کی مدد سے ٹٹولتے ہوئے سوچا۔ ”اور میں زندہ ہوں تو پھر مجھے نظر کیوں نہیں آ رہا۔“ میں نے دوبارہ سوچا۔ یقیناً میری بینائی چلی گئی تھی۔

میں ایک ناقابل بیان کرب سے گزر رہا تھا۔ کبھی مجھے اپنا وجود خلاء کی بیکراں وسعتوں میں چکراتا ہوا محسوس ہوتا تو کبھی تاریکی کے عمیق گڑھوں میں گرتا ہوا۔ شیکھر کی آواز بھی اب میرے کانوں میں نہیں پہنچ رہی تھی۔ قریب تھا کہ میں دہشت زدہ ہو کر چلا اٹھتا مگر اچانک میری بینائی واپس آ گئی۔ اب مجھے سب کچھ واضح دکھائی دے رہا تھا لیکن منظر ہمارے فلیٹ کا نہیں بلکہ یہ کسی عالی شان بنگلے کا ڈرائنگ روم تھا۔ میں ایک دبیز اور امپورٹڈ صوفے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میرے بدن پر ایک نفیس تھری پیس سوٹ موجود تھا۔ سامنے ٹیبل پر ایک اعلیٰ شراب کی بوتل اور دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔

یکا یک ڈرائنگ روم کا بیرونی دروازہ کھلا اور شیکھر مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ بریف کیس بھی موجود تھا۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر پرمسرت انداز میں بولا۔ ''یہ دیکھ راکیش! ہم لوگ کروڑ پتی بن گئے ہیں...... یہ...... یہ بریف کیس نوٹوں سے بھرا ہوا ہے اور یہ رقم ہم دونوں کی ہے۔''

اتنا کہہ کر وہ تقریباً ناچنے کے انداز میں ڈرائنگ روم کے دبیز قالین پر جھومنے لگا۔ ''ابے تو بھی ناچ میرے ساتھ۔'' وہ بریف کیس کو فضا میں اچھال کر دوبارہ پکڑتے ہوئے بولا۔

میری طرح اس کے جسم پر بھی ایک قیمتی تھری پیس سوٹ موجود تھا۔ چند لمحے رقص کرنے کے بعد وہ دوبارہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''راکیش! چل تو دو پیگ تیار کر، میں ابھی چینج کر کے آتا ہوں پھر اکٹھے بیٹھ کر چسکیں گے۔''

پھر اس سے پہلے کہ میں اپنی حیرت دور کرنے کے لیے اس سے کوئی سوال کرتا وہ ڈرائنگ روم سے ملحق ایک دروازے کی طرف بڑھ گیا اور میں بیٹھا ہونٹ کاٹتا رہ گیا۔

''یہ...... یہ شیکھر مجھے راکیش کہہ کر کیوں پکار رہا تھا۔ کہیں سالے کا کوئی اسکرو تو ڈھیلا نہیں پڑ گیا۔''

اس کے جانے کے بعد وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا لیکن یہ سب گورکھ دھندا میری سمجھ سے باہر تھا۔ ہم ایک عام سے فلیٹ سے ایک عالی شان کوٹھی تک کیسے پہنچے۔ یہ تھری پیس سوٹ اور مہذب لوگوں کا انداز گفتگو؟ ہم دونوں تو موالی اور پاکٹ مار تھے، پھر یہ اچانک ہم دونوں کی جون کیسے بدل گئی؟''

یہ تمام سوالات مجھے ڈسٹرب کر رہے تھے مگر ان کے جوابات میرے پاس نہیں تھے تنگ آ کر میں نے سر جھٹکا اور ٹیبل پر موجود گلاسوں میں غیر ملکی وہسکی انڈیلنے لگا۔ اب میں شیکھر کا منتظر تھا تا کہ اس سے یہ معلوم کر سکوں کہ یہ سب کیسے اور کیونکر ہوا اور وہ مجھے راکیش کہہ کر کیوں پکار رہا ہے؟

چند لمحوں کے بعد شیکھر اسی دروازے سے نمودار ہوا تو وہ کچھ نروس لگ رہا تھا۔

''کم آن شیکھر! ٹیک دی ڈرنک۔'' اسے پریشان دیکھ کر غیر ارادی طور پر میری زبان سے یہ الفاظ ادا ہو گئے حالانکہ میں اس سے اس کا یا پلٹ کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا مگر کوئی ان دیکھی طاقت مجھے سوالات کرنے سے روک رہی تھی۔ اچانک میری نظر ڈرائنگ روم کی دیوار پر لٹکتے ہوئے کیلنڈر پر پڑی اور میری آنکھیں شدت حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

کیلنڈر پر 1960ء لکھا ہوا تھا۔ ''یہ ہم چوالیس سال پیچھے کیسے چلے گئے؟'' صرف ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا اور پھر کیلنڈر سے نگاہیں ہٹا کر جونہی شیکھر کی طرف دیکھا مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ شیکھر نے مجھ پر پستول تان رکھا تھا۔

''ش... شیکھر... میں تمہارا..... دوست ... ہوں تت... تم... مجھے... نہیں مار... سکتے۔'' شدت خوف سے میری زبان لڑکھڑا رہی تھی مگر شیکھر بے رحم نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

دوسرے لمحے اس کے پستول نے ایک شعلہ اگلا اور میں تڑپ کر صوفے سے نیچے قالین پر جا گرا۔ میرا اکھڑتی سانسوں اور ڈوبتی سماعتوں میں صرف شیکھر کے قہقہے گونج رہے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے تاریکی کے پردے حائل ہوتے چلے گئے اور پھر میرے حواس جواب دے گئے شاید میں مر چکا تھا۔

☆☆☆

''اے شیکھر! سالا اپن کب سے تجھے آواز لگا رہا ہے مگر تو مورتی کا مافک کھڑا ہے۔'' کسی نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا اور میں ایک دم ہوش میں آ گیا۔

مگر یہ کیا، ہوش میں آنے کے بعد میں نے دیکھا تو اسی جگہ اپنے فلیٹ میں موجود تھا۔ تو کیا میں اب تک کوئی خواب دیکھ رہا تھا کیوں کہ شیکھر تو بدستور اپنے ہاتھ میں بیگ لیے میرے سامنے کھڑا تھا۔ اچانک ایک خیال بجلی کی طرح میرے دماغ میں کوند گیا۔ ''شاید شیکھر اب تک پچھلے جنم کے بارے میں سچ کہتا رہا ہے۔'' میں نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر ذہن پر زور ڈال کر چند لمحے پہلے دیکھے جانے والے مناظر یاد کرنے لگا۔ ذرا سی کوشش کے بعد وہ سب کچھ میرے ذہن میں واضح ہوتے چلا گیا۔ میں خود کو اور شیکھر کو بہت بڑے بزنس مین کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ پچھلے جنم کی ساری باتیں، ساری یادیں برق رفتاری کے ساتھ میرے ذہن میں تازہ ہو رہی تھیں۔ حتیٰ کہ شیکھر کے ہاتھوں مارے جانے تک کے حالات مجھ پر منکشف ہو گئے۔ شیکھر نے محض دولت کے لالچ میں مجھے گولی ماری تھی۔

اس سے پہلے کہ میں شیکھر سے کچھ کہتا وہ خود ہی بول پڑا۔ ''چل سالا پنوتی تو دارو کا بندوبست کر، اپن ڈریس بدل کر آتا ہے پھر اکٹھے بیٹھ کر اپن لوگ پئیں گے۔'' یہ کہہ کر اس

نے آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا مگر پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات نظر آئے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی الجھن کا شکار ہو۔ شاید اس کے دماغ میں بھی پچھلے جنم سے متعلق یادیں تازہ ہو رہی تھیں۔

پھر اچانک پلک جھپکنے کی دیر میں وہ سب کچھ ہو گیا جس میں میرے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ کسی ان دیکھی قوت نے میرے ہاتھوں کو تحریک دی۔ میں نے جیب سے پستول نکالا اور شیکھر کو کچھ بولنے کا موقع دیئے بغیر گولی چلا دی۔

دھائیں کی آواز کے ساتھ ہی شیکھر کی پیشانی میں سوراخ ہو گیا۔ وہ اچھل کر پشت کے بل ننگے فرش پر گرا اور نوٹوں سے بھرا بیگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

☆☆☆

''ش..... شیکھر..... یہ..... تت تم سے..... کک..... کیا..... کیا..... س س ..... سالا.....نزع کے عالم میں اس کی زبان سے بمشکل چند الفاظ نکلے اور پھر وہ ٹھنڈا ہو گیا۔

''کتے! میں شیکھر نہیں راکیش ہوں، پچھلے جنم میں یہی کچھ تم نے میرے ساتھ کیا تھا۔ میں نے تو اپنا قرض چکایا ہے۔'' میں نے اس کے مردہ جسم پر ایک اور گولی چلاتے ہوئے کہا۔

''اور..... اور یہ دیکھ ہم دونوں ایک ساتھ کھلاس نہیں ہوئے۔ پچھلے جنم کے متعلق تم نے سب کچھ صحیح کہا تھا سچ کہا تھا مگر تمہارا سچ ادھورا تھا رے۔ تم نے ایسا کاہے کو کیا رے؟ یہ دیکھ تمہاری چتا جلانے کے لیے میں سالا زندہ..... '' آخری الفاظ ابھی میری زبان پر ہی تھے کہ معاً دھائیں کی آواز گونجی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے جلتا ہوا انگارا میری پشت پر رکھ دیا ہو۔ پستول میرے ہاتھ سے نکل کر فرش پر پھسلتا چلا گیا۔ میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو ایک پولیس انسپکٹر چند سپاہیوں کے ساتھ ریوالور تانے حقارت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

پولیس انسپکٹر کے ریوالور نے دوبارہ شعلہ اگلا اور گولی میرے سینے میں پیوست ہو گئی۔ میں لڑکھڑا کر نیچے گرا اور پھر میرا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

''شاید شیکھر نے پورا سچ کہا تھا، پچھلے جنم میں بھی یہی کچھ ہوا ہوگا'' میرے ذہن میں ابھرنے والا یہ آخری خیال تھا۔ اس کے بعد میرے احساسات و جذبات میرا ساتھ چھوڑ گئے۔

